شمعِ فروزاں

یادیں، یادداشتیں

عبداللہ جان جمالدینی

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب	.....	شمعِ فروزاں
مصنف	.....	عبداللہ جان جمالدینی
موضوع	.....	یادداشتیں
پہلی اشاعت	.....	2006
دوسری اشاعت	.....	2017
تعداد	.....	1000
قیمت	.....	120روپے
پبلشر	.....	سنگت اکیڈمی
فون نمبر	.....	03003829300

ISBN: 978-969-673-006-4

ملنے کا پتہ:

سنگت اکیڈمی

206، مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ۔

فون:+92-81-2843358

email: books@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net

انتساب

طبقاتی اور قومی استحصال سے نجات کی جدوجہد
کرنے والوں کے نام!

خوش تر آں باشد کہ سرِّدلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

- مولانا جلال الدین رومیؒ

ترتیب

پیش لفظ	گل بنگلوری	7
	اولی بہر	13
	دومی بہر	22
	سہی بہر	31
	چارہمی بہر	37
	پنچمی بہر	47
	ششمی بہر	54
	پتمی بہر	63
	ہشتمی بہر	72
	نہمی بہر	81

پیش لفظ

جمعہ کا دن تھا۔ شام کے غالباً 6 بجے تھے کہ میں نے ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب کو فون کیا۔ سلام اور حال حوال کے بعد میں نے ان سے کسی کتاب کے بارے میں معلوم داری کی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا کہ کسی کو بھیج کر وہ کتاب لے جائیں۔ نیز واجہ عبداللہ جان جمالدینی کے کچھ مضامین جو سنگت میں گاہے بہ گاہے شائع ہوتے رہے ہیں، ان کو ''شمعِ فروزاں'' کے نام سے ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کرنا ہے۔ آپ نے اس کے لیے پیش لفظ لکھنا ہے۔ ٹیلی فون کی Reception کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں آخری بات پوری طرح نہ سمجھ پایا۔

دوسرے روز میرے نواسے نوید اعظم نے ڈاکٹر صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب اور خاکی لفافے میں ''شمعِ فروزاں'' کے صفحات لاکر مجھے تھما دیے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چٹ پہ ڈاکٹر صاحب نے تحریر کیا تھا کہ کتاب کا پیش لفظ لکھنا ہے۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ محترم استاد عبداللہ جمالدینی کے بارے میں مجھ جیسا شخص کیسے لکھ سکتا ہے۔ ان کے بارے میں ان

کے پائے کا کوئی سکالر یا ان کی جدوجہد میں شامل کوئی ساتھی لکھ سکتا ہے؛ جیسا کہ سائیں کمال خان شیرانی، سردار بہادر خان بنگلزئی، پروفیسر نادر قمبرانی' انجم قزلباش، وغیرہ۔ میں عبداللہ جان جمالدینی کے شاگردوں کے پائے کا بھی نہیں ہوں۔ 'قہرِ درویش برجانِ درویش' کے مصداق میں محترم ڈاکٹر شاہ محمد مری جیسے پارہ صفت انسان کو انکار نہ کر سکا۔

لائق صد احترام جناب عبداللہ جان جمالدینی سے میری شناسائی ''نوائے وطن'' کے دفتر میں جہاں اس وقت لالہ غلام محمد شاہوانی بھی موجود تھے، جون 1955 میں ہوئی۔ میں بلوچستان کے واحد کالج' سائنس کالج میں پڑھتا تھا۔ بس وہ دن اور آج کا دن میں نے مستقلاً ان کی شاگردی قبول کر لی۔ ان سے ''نوائے وطن'' کے دفتر یا پھر **لٹ خانہ** میں ضرور ملنے جاتا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا سلسلہ اُس وقت اور بھی بڑھا، جب ہم بلوچستان یونیورسٹی میں یک جا ہوئے۔ 1985ء میں جب مجھے ان کے مکان کے پاس ہی ایک مکان الاٹ ہوا تو پھر ہم دن کو دفتر اور شام کے وقت اکٹھے اٹھتے بیٹھتے۔ شام کے وقت جمالدینی صاحب، نادر قمبرانی، میر عاقل خان، رودینی صاحب اور عبدالرحمٰن فکر صاحب اور کبھی کبھار پروفیسر برکت علی صاحب باہر ٹہلنے کے لیے نکل پڑتے اور خالی جگہ جسے میر عاقل خان نے ''نوشکی جدید'' کا نام دیا تھا، بیٹھ جاتے اور حالات حاضرہ، ادب، تاریخ کسی نہ کسی موضوع پہ بحث چھڑ جاتی اور شام اندھیرے تک وہاں بیٹھے رہتے۔

میں نے اپنی نوکری کے آخری دس سال عبداللہ جان جمالدینی صاحب کی معیت میں گزارے اور اب تک ان کے ہاں آنا جانا رہتا ہے۔ اگر جانے میں کبھی دیر ہو جائے تو وہ خود تکلیف کر کے گھر پہ فون کر کے حال احوال معلوم کر لیتے ہیں۔ ان کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے، تو میں نے انہیں ایک بہت ہی مخلص انسان پایا ہے۔ انہیں ہمیشہ انسانیت کا پرچارک، امن و ایمنی کا وکالت کرنے والا، جنگ سے نفرت کرنے والا، مذہبی گروہی اور لسانی تعصب سے مبرا پایا ہے۔ آپ ایک دفعہ ان سے مل لیں تو ان کی باتوں کی مٹھاس،

ہر موضوع پر عالمانہ بات چیت، آپ کو ان کا گرویدہ بنا دے گی۔ پچاس سال کے لمبے عرصے میں میں نے انہیں کبھی بھی غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ مسکرا کر ملتا ہے، حال احوال پوچھتا ہے۔ اللہ نے انہیں صبر اور برداشت کا عطیہ دیا ہے۔ ان سے ملنے والا ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کہ وہ عرصہِ دراز سے ان سے واقف ہے۔

میر عبداللہ جان جمالدینی کی زندگی، معاشرہ میں آگاہی، روشن خیالی، خردافروزی اور درس وتدریس میں گزری ہے۔ انہوں نے رژن (شعور) اور روشن فکری کی علمبرداری کی ہے اور کسی قسم کی تنگ نظری اور تعصب کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ وہ ہر طرح کے شاؤنزم، مذہبی اور گروہی تعصّبات کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی حقوق کا بڑا احترام ہے۔ وہ سیکولرازم کے قائل ہیں۔ مظلوم انسانوں کے حقوق کی وکالت کرتے ہیں۔ جھوٹے، فریبی، دھوکہ دینے اور چاپلوسی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔ قبائلی جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے خاندان والوں کا آپس میں جھگڑا ہوا۔ ان کی ثالثی اور کوشش کے باوجود بات بڑھتے بڑھتے کشت وخون تک جا پہنچی، تو آپ نے اپنے گاؤں جانا کافی عرصہ کے لیے چھوڑ دیا۔ گوکہ وہ خود سردار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اس ادارے کو بلوچوں کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

عبداللہ جان جمالدینی مردوں اور خواتین کو یکساں علم حاصل کرنے کی وکالت کرنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق کے حامی نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تعلیم وفن ہر ایک کے لیے ہو۔ سماج کو بدل ڈالنے، ترقی دینے اور جہالت کے گھپ اندھیروں سے نکالنے کے لیے، مرد وزن دونوں کے لیے علم حاصل کرنا از حد ضروری ہے۔ وہ سماج کو اس کے ارتقائی مراحل میں ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ علم کو بنیادی انسانی حقوق سے جوڑتے ہیں۔ مادری زبانوں میں علم حاصل کرنے کی پرزور وکالت کرتے ہیں کہ جس سے زبان وادب کی ترقی ہوتی ہے۔ وہ اس بات پہ زور دیتے ہیں کہ سکولوں،

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سوائے انگریزی یا ایک آدھ اور مضامین کے تمام، مضامین مادری زبانوں میں پڑھائے جائیں۔ وہ ترقی، خوش حالی آسودگی اور زندگی کی جدوجہد میں بالیدگی کے عنصر کو تعلیم سے مشروط کرتے ہیں۔

پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ ان سے ایک دفعہ ملنے کے بعد آپ اُن کے گرویدہ ہو جائیں گے، بار بار ان سے ملنے کی خواہش آپ کے دل میں جاگزیں ہوگی۔ وہ انتہائی شستہ زبان میں ٹھہر ٹھہر کے آپ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کریں گے۔ ان کے دوستوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ملک بھر کے ترقی پسند، روشن خیال، انسانیت دوست ادیب وشاعر جب بھی کوئٹہ آتے ہیں تو وہ آپ سے ملنے ضرور آتے ہیں۔ انہی خیالات کی وجہ سے آپ نے شاہی قلعہ لاہور اور قلی کیمپ کوئٹہ کی صعوبتیں جھیلیں۔ ملک سے باہر کی دنیا میں بھی آپ کی ایک اچھی پہچان ہے۔ علم وادب کے سلسلے میں علم دوست لوگ برطانیہ اور یورپ کے کئی ملکوں میں آپ کو بلا کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوئے ہیں۔

عبداللہ جان جمالدینی طالب علموں سے بڑے پیار اور تپاک سے ملتے ہیں۔ آپ ان اچھے استادوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے لیکچر میں پوری کی پوری کلاس حاضر ہو کر ہمہ تن گوش آپ کی باتیں سنتی تھی۔ بہت سارے طالب علم آپ کے دفتر اور گھر آ کر رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ بلوچی زبان وادب پر کام کرنے والی سویڈن کی کارینا جہانی اور جاپان کے دو طالب علم بھی آپ کے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کی ہمیشہ کوشش ہوتی تھی کہ آپ اپنے علم کو طالب علموں تک پہنچائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے نیک ارادے میں سرخرو ہوئے ہیں۔ آپ نے بلوچی اور براہوئی زبانوں کی ترقی کے لیے بے حد کام کیا ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے بلوچی کے قدیم شعرا کا کلام بلوچستان کے مختلف علاقوں سے یک جا کر کے زمانے کی دست برد سے بچایا ہے۔ آپ بلوچی اور اردو کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ نے انسانی طرزِ عمل، خدمت، نیک نیتی اور روشن خیالی سے بلوچستان میں جو مقام پیدا کیا ہے اس مقام تک بلوچستان کے بہت کم سپوت پہنچے ہیں۔ دعا ہے کہ آپ صحتِ کاملہ کے ساتھ اپنے علم سے ہمیں روشناس کرتے رہیں۔

گل بنگلزئی

16 مئی 2006ء

شمعِ فروزاں

1

شاہ محمد کا کہنا ہے کہ وہ ساتویں کلاس میں اپنے گاؤں سے کئی میل دور، دکی ہائی سکول میں پڑھ رہا تھا۔ یہ سال 1967 کا تھا کہ اس کے والد کو قتل کیا گیا۔ یہ نہ قبائلی دشمنی کی وجہ تھی اور نہ ہی جائیداد کا جھگڑا تھا، بلکہ عمل اور فکر کا اختلاف تھا۔ اس کے والد حاجی محمد مراد مرحوم ایک دین دار انسان تھے۔ اپنے لوگوں کو علم سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں سکول، ہسپتال اور سڑکیں بنوانا چاہتے تھے۔ اور ان کے اس عمل کو کچھ لوگ پسند نہیں کر رہے تھے۔

حاجی محمد مراد کا قصور بس اتنا ہی تھا۔ وہ علم کی شمع روشن کرنا چاہتے تھے۔ اس کی پاداش میں انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ ان کے والد حاجی محمد مراد صوفی منش، انسان دوست اور علم دوست انسان تھے۔ قبائلی معاشرہ کی ان قوتوں نے انہیں راستے سے ہٹالیا جو کہ قبائلی عوام کو علم سے بے بہرہ اور دور رکھنا چاہتی تھیں۔ ان قوتوں کی ہمیشہ سے یہ

خواہش رہی ہے کہ قبائلی عوام بے خبر اور گنوار رہیں تا کہ یہ بااختیار لوگ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔

شاہ محمد مری کے والد حاجی محمد مراد کی فکر، عمل اور شخصیت کے بارے میں میں نے بہت سوچ اور فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ نہایت ہی بھلے انسان تھے۔ اس نتیجہ کا ماخذ وہ سادہ خوب صورت اور میرے لیے پر کشش تحریر تھی جو ایک صوفی منش اور انسان دوست کے قلم سے ماہنامہ **سنگت** کے صفحوں پر شائع ہوئی۔ میری عادت ہے کہ **سنگت** میں اشتہارات کے سوا کوئی بھی تحریر میری نظروں سے نہیں چھوٹتی۔ بہت اشتیاق اور انتظار کے بعد جب مجھے **سنگت** کا پرچہ ملتا ہے تو میں سب کچھ، چاہے کتنی ہی دلچسپ اور خوب صورت کتاب اور تحریر ہو، اسے چھوڑ کر **سنگت** پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ جب تک اس شمارے کو ختم نہیں کرتا، کچھ اور نہیں پڑھتا۔ اس بیماری کے عالم میں جب کہ میری دیگر حرکات اور مصروفیات محدود ہو چکی ہیں، میرا کام بس پڑھنا ہی ہے۔ لکھنا تو اب بہت مشکل ہو چکا ہے۔ تو میں نے اس سادہ تحریر کو جو حاجی محمد مراد کے بارے میں تھی، پڑھا۔ بہت پسند آئی۔ لکھنے والے کا نام صوفی محمد مصری کشمیری تھا۔ اس نے حاجی صاحب کی انسان دوستی اور غریب پروری کی تعریف کی ہے۔ سب سے زیادہ اس بات کو سراہا ہے کہ حاجی صاحب نے انہیں پڑھنے کی رغبت دی۔ اور اس سے اس کی زندگی سنوری۔

مجھے صوفی محمد مصری کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ کل ہی میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ڈاکٹر شاہ محمد سے ٹیلی فون کی بات چیت کے دوران کیا۔ تو اس نے بتایا کہ محمد مصری آئے تھے اور کئی روز اُن کے گھر میں رہ کر چلے گئے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے میں ان دنوں کوئٹہ میں موجود نہ تھا۔ گاؤں چلا گیا تھا۔ اس طرح اس نیک دل انسان کی ملاقات سے محروم رہا۔ ورنہ شاہ محمد ضرور مجھے ان سے ملواتے۔

صوفی محمد مصری نے کم از کم مجھے حاجی محمد مراد جیسی شخصیت سے واقف کیا ہوتا۔

حالاں کہ برسوں سے میں ان کے نیک فرزند ڈاکٹر شاہ محمد سے قریب ترین تعلقات سے بہرہ ور ہوں۔

شاہ محمد مری کی عجیب طبیعت ہے کہ وہ اپنے بارے میں اور اپنے اجداد اور بزرگوں کے بارے میں کبھی بھی نہیں بولتا۔ حالاں کہ یہ عادت اکثر لوگوں میں ہوتی ہے۔ اپنے بارے میں تو میرا یہی خیال ہے۔ (''ہے بے بختی!'' یہ شاہ محمد مری کا تکیہ کلام ہے۔ جو مجھے پسند ہے۔ اس کے معنی ہیں: سانحہ، بدقسمتی۔ جب کوئی بات یا واقعہ شاہ محمد کو اچھا نہ لگے، تو وہ یہ تکیہ کلام استعمال کرتا ہے)۔

شاہ محمد کو قسمت نے اپنے والد کے اس انسان دوستانہ اور نیک مشن کو جاری اور زندہ رکھنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہمیں فطرت کے اس عمل کا احسان مند ہونا چاہیے۔

شاہ محمد نے خود بھی بہت اعلیٰ اور اچھی تعلیم اور اچھے انسانوں کی سرپرستی میں صحیح تربیت و پرورش حاصل کی۔ پھر اسے ان اچھے انسانوں کے علاوہ اپنے برادرِ بزرگ میر میروخان مری کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس کے اچھائی کے عمل میں کبھی بھی مخل نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اور اس کے خاندان کے دیگر افراد علم کے زیور سے بہرور ہوئے ہیں، اور ہو رہے ہیں۔

اب تو شاہ محمد کا گاؤں علم کا گہوارہ ہو رہا ہے۔ اس نے اپنے والد ''حاجی محمد مراد شہید'' کے نام سے گاؤں میں ایک بڑی لائبریری اور مطالعہ گاہ قائم کی ہوئی ہے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر شاہ محمد نے کئی اچھے کام کیے ہیں۔ اس نے اپنی کوشش سے نوجوان ڈاکٹروں اور دیگر ترقی پسند انسانوں کو بہت متحرک کرنے کی کوشش اس نوعمری میں کی ہے، اور لگاتار یہی اس کا عمل ہے۔ اس کا Moto، مطمع نظر ''ترقی اور آگہی'' ہے۔ ڈاکٹروں میں تنظیم کاری کے علاوہ اس نے ان علم دوست اور دانش وروں سے رابطہ کر کے ترقی پسند لکھاریوں کو یک جا ہونے میں بڑی گرم جوشی اور محنت سے کام کیا ہے۔

میرا مقصد صرف ڈاکٹر شاہ محمد کی تعریف کرنا نہیں۔ اگرچہ یہ بھی مقصود ہے۔ میرا نظریہ ہر اچھے عمل کی تعریف کرنا ہے۔ چاہے وہ کسی بھی گوشہ سے آئے۔ نیک عمل ہی ایسی چیز ہے، جس کی تعریف کی جانی چاہیے۔ عمل کرنے والے کے سیاق وسباق کو میں نہیں دیکھتا۔ صرف اس کا نتیجہ اور مقصد منظورِ نظر ہوتا ہے۔ نیک عمل میں اسے سمجھتا ہوں جو انسان کی بھلائی، ترقی اور زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کیا جائے۔ لہٰذا شاہ محمد کا عمل، جب سے میں اس کی قربت میں رہا ہوں، اسی مقصد کے لیے مجھے معلوم ہو رہا ہے۔ نہ میں نے اُسے اپنی تعریف کرتے سنا ہے۔ میرے نزدیک وہ نہ شہرت طلب انسان ہے، نہ جاہ طلب۔ ان چیزوں سے وہ دور ہے۔ اور جو لوگ اس غرض کے لیے کام کرتے ہیں، وہ اپنی شہرت کے طلب گار نہیں ہوتے۔ شاہ محمد کو میں نے ایسے لوگوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے دیکھا اور سنا ہے: ''ہے بے بختی''۔

شاہ محمد میری نگاہ میں اس پسماندگی، جہالت اور بے بختی کے ماحول میں ''ایک شمع فروزاں'' ایک روشن قندیل ہے، ایک Candle (شاید یہ یورپین لفظ Candle اسی مشرقی لفظ قندیل سے آیا ہو، بہت ممکن ہے)۔ اور وہ میرے خیال میں ''ایک جلتا چراغ'' ہے۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔

شاہ محمد نے اس عمل کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے۔ اُس نے اِس مقصد کے لیے اچھے لوگوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا ہے۔ ڈاکٹر امیر الدین مرحوم اور پیارے دوست شیام کمار، ڈاکٹر سرور خان کے ساتھ مل کر بہت کچھ کیا ہے۔ کئی برسوں سے ترقی پسند ادیبوں کا اتحاد اور تقریبات۔ اس میں کراچی کے دانش وروں، ادیبوں اور قلم کاروں سے مل کر انہیں کوئٹہ بلا کر تقریبات منعقد کیں۔ حقوقِ انسانی کی محترم جدوجہد کرنے والی نامور شخصیات کو بلوا کر بلوچستان میں اس تحریک کو بڑھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر شاہ محمد اور اس کے ترقی پسندانہ خیالات رکھنے والے ڈاکٹروں نے ڈاکٹروں میں ترقی

پسند گروپ منظّم کرنے کی کوشش کی۔ جگہ جگہ میڈیکل کمیپ منظّم کیے۔ مقصد یہ کہ شاہ محمد انسانوں کی خدمت میں ہمیشہ اور ہمہ تن برجستہ رہا۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ جو ان خیالات میں ان سے متفق رہے ہوں، مل کر کام کرتا رہا ہے۔ خدا کرے کہ اس کی عمر زیادہ ہو۔ بڑا دکھ تو یہ ہے کہ اس کے نہایت ہی نیک، قابل اور ہمہ تن کام میں مگن ساتھی ڈاکٹر امیر الدین ان سب ہم خیال دوستوں کو اور خصوصاً شاہ محمد کو تنہا چھوڑ کر موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ''ہے بے بختی!''.....کیا کیا جا سکتا ہے۔

اب امیر الدین کو کہاں ڈھونڈیں۔ مردہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ اب تک کے انسان کا یہی تجربہ ہے۔ البتہ اس کے عمل کی پیروی کی جا سکتی ہے۔ اسی نیک عمل میں وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ ہمت پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ بہر کیف اچھے اور نیک ساتھی ایسا کر سکتے ہیں۔

امیر الدین کے گزر جانے میں میرا خیال ہے کہ سب اچھے انسانوں، غریبوں اور مظلوموں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ سب سے زیادہ اس کے قریبی ساتھیوں ڈاکٹر شاہ محمد، ڈاکٹر سرور جان اور شیام کمار کو۔ ڈاکٹر خدائیداد اور میں تو ویسے ہی اب ناکارہ اور ڈس ایبل (Disable) ہو چکے ہیں۔ فطرت کا تماشا ہے کہ جنہیں زندہ رہنا چاہیے، جن کی بے حد ضرورت ہوتی ہے، وہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ جو اپنے آپ پر اور دوسروں پر بوجھ ہوتے ہیں، وہ باقی رہ جاتے ہیں: ''ہے بے بختی''۔

میرے خیال میں امیر الدین کی باہمت، ذہین اور باوقار بیگم کو یقیناً ان کی غیر موجودگی بے حد ستا رہی ہوگی۔ ان کی ہمت دیکھیے کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ اسی وقار کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔ انہوں نے کراچی پہنچ کر امیر الدین کی موت کی خبر سن کر اور یہ معلوم ہونے پر کہ ان کا دوست ان کی میت کراچی دفنانے پہنچا رہا ہے، فوراً کہہ دیا کہ اگر میں کوئٹہ میں موجود ہوتی تو ایسا کرنے سے منع کرتی۔ کیوں کہ امیر الدین نے کئی مرتبہ کہا تھا کہ مجھے بلوچستان ہی میں، کوئٹہ میں دفن کیا جائے۔ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ بہر کیف جو ہوا

سو ہوا۔ ہم سب کو امیر الدین کی موت کا افسوس ہے۔ سب کے لیے ان کی موت باعثِ تاوان ہے: ''ہے بے بختی''۔

مگر سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر شاہ محمد اور **''سنگت''** کو ہوا ہوگا۔ یہ **''سنگت''** کے مندرجات اور شاہ محمد کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ جب ڈاکٹر امیر الدین اور ڈاکٹر شاہ محمد مکران اور اس کے ساحلی علاقہ گوادر کے دورے پر گئے تھے۔ شاہ محمد اس دورے کے حالات وواقعات **''سنگت''** میں نہایت ایمان دارانہ، دلچسپ اور حقائق پر مبنی تحریر کی صورت میں ''بلوچ ساحل اور سمندر'' کے عنوان کے تحت قسطوں میں لکھ کر شائع کرتے رہے۔ پڑھنے والوں نے اس تحریر کی اپنے ''سنگت کے ایڈیٹر کے نام خط'' میں پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اب تک **سنگت** میں کئی قاری اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ڈاکٹر شاہ محمد اس تحریر کو کتابی صورت دیں۔ میں نے بھی کئی مرتبہ شاہ محمد کو یہی کہا۔

غرض یہ کہ امیر الدین، ڈاکٹر شاہ محمد، ڈاکٹر سرور جان اور شیام کمار کبھی لاہور، اسلام آباد، پشاور اور کراچی گھوم کر آتے۔ اچھے اچھے انسانوں اور دانش وروں سے ملتے اور بہت ہی اچھی اور خرد افروز باتیں سناتے۔

ڈاکٹر شاہ محمد کو اپنے نیک اور دانش مند والد کی محبت تو کم نصیب ہوئی۔ وہ سکول میں تھے اور پھر والد کا سایہ کم عمری میں ان کے سر سے اٹھا۔ البتہ نیک اور سادہ اور رحم دل ماں کی محبت سے (والدہ کی موت جو میرے خیال میں تین چار سال پہلے واقع ہوئی)، اس کی مامتا سے وہ وابستہ رہے۔

میں نے شاہ محمد کے قلمی نام ''شان گل'' کے بارے میں پوچھا کہ کیا تمہارے کام کی مناسبت سے تمہیں ''شان گل'' کہا جاتا ہے۔ تو اس نے بتایا کہ میری امی شاہ بول سکتی تھیں مگر محمد نہیں بول سکتی تھی، اس لیے کہ اس کے خاوند (شاہ محمد کے والد) کا نام محمد مراد تھا اور مشرقی بلوچستان میں خواتین اپنے شوہر کا نام نہیں لیتیں۔ اس لیے ''محمد'' کہنا ان کے لیے

رواجاً ممنوع ٹھہرا۔ لہٰذا انہوں نے دوسرا پیارا نام گھڑا: شان گل۔ بچپن ہی سے مجھے پیار سے اسی نام سے پکارتی تھی۔ سو یہ امی کی محبت کی نشانی ہے۔ اس لیے میں نے ایک مقدس کاز اور علم سے اس نام کو وابستہ کیا۔ یعنی تحریر کے مقدس کام سے اور اب تک جگہ جگہ میں اس نام کو استعمال کر رہا ہوں۔ ضیا الحق کے مارشل لا میں اس نام سے انہوں نے کئی تحریریں لکھیں۔

شاہ محمد کے بچپن کو تصور میں لا کر اور اس کے اس عمل کو جو وہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ جب اُس کے والد کی شہادت ہوئی تھی اور وہ بچہ تھا تو اس نے اس واقعہ کو یقیناً نہایت درد اور الم سے محسوس کیا ہوگا۔ اور شعور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ وہ سوچتا ہوگا کہ اس شہادت کو کس طرح اپنے عمل اور زندگی کا حصہ بنایا جائے تو سکول میں اور بعد میں علامہ اقبال کی کتاب **'بانگِ درا'** کو پڑھتے ہوئے اسے ان کی مشہور نظم ''بچے کی دعا'' پسند آئی ہوگی۔ اور وہ یوں سوچتا اور بولتا ہوگا:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ' ضعیفوں سے محبت کرنا
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس راہ پہ چلانا مجھ کو

پس یہ نظم اُس کی زندگی کا موٹو (نصب العین) بن گئی۔ یوں بھی شاہ محمد، علامہ اقبال کو خوب پڑھتا ہوگا کیوں کہ جب اس کی والدہ فوت ہوگئی (''ہے بے بخت'') تو اپنے اس صدمہ کو شاہ محمد نے 'بانگ درا' سے علامہ کی طویل نظم ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' کو **سنگت** کے صفحے پر چھاپ کر اپنے غم کا اظہار کیا تھا۔

شاہ محمد نے علامہ کے اردو کلام کی کلیات، جیبی سائز کی خوب صورت کتاب میں مجھے عطیہ کی ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے (''ہے بے بخت'') وہ کتاب مجھے نہیں مل رہی۔ شاید گاؤں میں نوشکی چھوڑ کر آیا ہوں۔

شاہ محمد خوش قسمت ہے کہ اُسے چار سال لاہور کے علمی، ادبی، سیاسی اور مہذب ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع ملا؛ اچھے انسانوں اور دانش وروں کی صحبت میں۔ اُس نے اس صحبت سے کما حقہ استفادہ کیا۔ خصوصاً محترم سی آر اسلم اور سید مطلبی فرید آبادی کی صحبت۔ اور انہی کی رفاقت، میں انہوں نے صحافت، اچھی اور عظیم صحافت کا پیشہ سیکھا۔ بلکہ کچھ عرصہ ان کے مشہور پرچہ **''عوامی جمہوریت''** کی ادارت بھی کی۔ جب سی آر اسلم اور دیگر احباب ضیا مارشل لا کے دور میں جیل میں ڈال دیے گئے تھے تو پرچہ اس بلوچ مری کے حوالے کر گئے تھے: ''ہے بے بخت''۔ یک طرفہ تماشا دیکھئے: سی آر اسلم کی تعریف میں نے جب کی، مجھے سی آر اسلم کے بارے میں اور ان کی کمٹمنٹ، دانش مندی اور انسانی خدمات کے بارے میں شاہ محمد کے ذیعہ ہی معلوم ہوا۔ سیاست دانوں اور خود پسند لیڈروں کی طرح ایک مرض بائیں بازو کے لوگوں اور ترقی پسندوں میں کافی عرصہ تک رہا ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے نفرت اور ایک

دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ۔اس وجہ سے سنی سنائی باتوں نے مجھے اس شجرِ پُرثمر اور اچھے انسان سے دور رکھا: ''ہے بے بختی''۔

تو ایک دن (حال ہی میں) محترم بھائی احمد سلیم گھر آئے تھے۔میں نے سی آر اسلم کی تعریف کی اور ان کی زندگی کے متواتر مشن کو سراہا۔جس کے تحت انہوں نے غریبوں اور مظلوموں کے حقوق کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔تو انہوں نے کہا کہ یہ بات مبنی بر حقیقت ہے اور دل کو لگی کہ پرانے استادوں میں سے تو یہی ایک باقی بچا ہے۔خدا کرے وہ مزید جیے اور روشنی پھیلاتا رہے۔کیا اچھے انسان ہیں۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ بڑھاپے میں اور اس طویل علالت میں مجھے شاہ محمد اور ان کے رفقا کی سنگت نصیب ہوئی۔زندگی میں ماہنامہ ''**سنگت**'' نصیب ہوا۔ اور میں ماہنامہ ''**سنگت**'' اور اس شمعِ فروزاں سے وابستہ ہوا جو ہر طرف روشنی پھیلا رہی ہے۔ ان کی وجہ سے اچھے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، اور فیض حاصل ہو رہا ہے۔

شاہ محمد نے جو راستہ چنا ہے اور جس سمت کو جا رہا ہے، وہ نہایت ہی نیکی کی راہ ہے۔اس میں وہ سب کو آگہی، علم اور روشن خیالی کی طرف لے جا رہا ہے۔خدا کرے وہ ہمیشہ زندہ رہے اور یہ نیک کام کرتا رہے۔اور کئی شاہ محمد پیدا کر سکے۔

ڈاکٹر شاہ محمد نے بہت اچھا کیا کہ اپنے عمل اور فکر کو پھیلانے کے لیے تحریر کی راہ اپنائی ہے اور اس کے ذریعہ اپنی فکر، لوگوں خصوصاً نوجوان ادیبوں، طالب علموں اور دانش وروں میں پھیلا رہا ہے۔

2

تو جناب! قصہ چل رہا تھا شاہ محمد اور ''**سنگت**'' کا۔شان گل نے تحریر کی شمع روشن کی؛ پہلے ''نوکیں دور'' کی۔ یہ شمع پہلے عبدالکریم شورش (بابو شورش) نے بڑی مشکل سے روشن کی تھی۔ون یونٹ کا زمانہ تھا۔ بڑی مشکل سے ڈیکلریشن حاصل ہوتا تھا۔پھر شورش بابو تو تھے ہی درویش۔ پیسہ ٹکہ تو ان کے پاس تھا نہیں۔بس جنون بے حد زیادہ یعنی کمٹمنٹ، غریب انسانوں سے۔جس کا اکثر و بیشتر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ بد بخت لوگ ہی ایسا کرتے ہیں جو ایسے عظیم انسانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ایک واقعہ یاد آیا۔شورش بابو تو ویسے عوامی قبولیت کے مالک تھے۔دو مرتبہ سائیکل سے گرے۔ایک مرتبہ تو انہیں کھلے گٹر میں گرنے سے بہت چوٹ آئی۔ یہاں تک کہ وہ ہسپتال میں داخل کیے گئے۔ظاہر ہے شورش کو جنرل وارڈ میں ہی جگہ مل سکتی تھی، ملک پناہ کی طرح۔لیکن اس کی کمٹمنٹ دیکھئے۔ہسپتال میں اسے خیال آیا کہ عام مریضوں کے لیے وہ کیا

کرسکتا تھا۔اس نے سوچا کہ وارڈ میں ایک وال کلاک کی ضرورت ہے۔ دیوار پر کسی بڑے گھڑیال کی۔ چنانچہ ایک کلاک کسی سنگت سے منگوا کر اپنے پیسوں سے خرید کر لگوا دیا۔ کافی عرصہ تک وہ گھڑیال اس وارڈ میں نصب تھا۔ بیماری کے دوران ایک بڑے لیڈر نے اس پر احسان کیا۔ اس کی بیمار پرسی کی۔ اس غریب انسان کا مذاق اڑایا۔ اپنی برتری اور دانش مندی کا اظہار کیا۔شورش بابو کو سر پر چوٹ آئی تھی۔شاید پٹی باندھی گئی ہو۔ میں ان دنوں کوئٹہ میں نہ تھا جو ان کے پاس جاتا۔اس قبائلی اور سیاسی لیڈر نے ہنس کر کہا،''بابو پروانہ کرو تمہارے سر میں کچھ نہیں جس کا نقصان ہوا ہو''۔شورش بچارہ ہنس دیا۔شاید وہ جانتا ہوگا کہ اس کے سر میں تو بہت کچھ ہے بلکہ اس کے برعکس مذاق اڑانے والے کا سر اور دل دونوں خالی ہیں۔

شورش صاحب ترقی پسند بلکہ کمیونسٹ فکر کے مالک تھے۔ان دنوں برصغیر کے زمانے میں،یعنی بدقسمتی سے یہ برصغیر تقسیم کا شکار نہ تھا۔کمیونسٹ اور ترقی پسند یہ نام اکثر رکھتے تھے۔اپنی کمیونسٹ وابستگی کا اظہار کرنے کے لیے؛ نیوا یج ، نیا زمانہ، سویرا، صبحِ نو، پیغامِ جدید۔

شان گل (شاہ محمد) کو شورش بابو کے نظریہ اور کمٹمنٹ سے آگہی ہوئی تو وہ شورش بابو کے لڑکے سے ملے۔اس سے دوستی کی اور شورش بابو کے متعلق پوچھتے رہے۔ بالآخر انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ شورش کے مشن اور فکر کو زندہ رکھنے کے لیے ''نوکیں دور'' کا نئے دور سے آغاز کیا جائے۔ان کے بڑے بیٹے شیہک نے اتفاق کیا تو ''نوکیں دور'' کا نئے سرے سے اجرا ہوا۔ادارات اور اشاعت کی ذمہ داری ڈاکٹر شاہ محمد مری نے لی۔نہایت آب وتاب اور عزم وارادہ سے **نوکیں دور** چھپنے لگا۔ چھپتے ہی قارئین میں مقبول ہوا۔

شاہ محمد نے شورش بابو کی بعداز مرگ پذیرائی بہت کی۔ان کی دیکھا دیکھی دیگر

دانش وروں نے شورش بابو کی یاد اور قدردانی شروع کی۔شورش بابو کی قبر جوان کے دوستوں نے ان کی تمنا اور وصیت کے مطابق ان کی شاہراہ پر بورڈ کے پاس بنائی تھی۔یعنی انہیں وہیں دفن کیا گیا تھا۔اب شاہ محمد نے اس قبر کو نئے سرے سے بنوایا اور اس کا احاطہ تعمیر کروایا۔اس کے ساتھ ہی ایک خدا کے نیک بندے سے ایک ایکڑ زمین بھی اس کے لیے حاصل کی۔ شورش بابو نے بعد میں اپنے آپ کو کریم (عبدالکریم) امن کے نام سے کہلوانا شروع کیا۔یہ دونوں نام ان کے مرقد کی لوح پر کندہ کیے گئے۔

بدقسمتی سے (ہے بے بختی!) 1993 میں مجھ پر فالج کا حملہ ہوا، اور میں ہسپتال پہنچا۔شاہ محمد مری، ڈاکٹر امیر الدین اور تمام احباب مجھ پر کچھ زیادہ مہربان تھے۔ ہمیشہ میری دلجوئی کے لیے آتے۔ چھ مئی کو مجھ پر حملہ ہوا تھا اور آٹھ مئی کو میری تاریخ پیدائش تھی۔دوستوں نے وہیں ہسپتال میں یوم پیدائش کی میری تقریب منائی اور کیک کٹوایا۔یہیں دوستوں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنی یادداشتیں **''لٹ خانہ''** کے نام سے لکھ کر ہر ماہ **نوکیں دور** میں چھپوانے کے لیے انہیں دوں۔ان عوام دوست اور ترقی پسند دوستوں نے مجھے اس قدر حوصلہ دیا کہ میں اپنی بیماری اور نااہلی کو بھول گیا۔ میں نے لکھنا شروع کیا۔اور ''لٹ خانہ''، **نوکیں دور** میں چھپنا شروع ہوا۔ پڑھنے والوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ایک ماہ بعد جب میں گھر واپس لایا گیا تو حسبِ دستور احباب جن سے فکری ہم آہنگی اور محبت تھی، وہ ہر جمعہ کو میرے گھر ایک دو گھنٹے کے لیے جمع ہوتے اور ہر طرح کا تبادلہ خیالات ہوتا۔اور اس گروہ کا نام 'جمعہ پارٹی' پڑ گیا۔جب تک ہفتہ وار چھٹی سرکاری طور پر جمعہ کے روز ہوتی تھی، مگر بعد میں پھر اتوار کو چھٹی ہونے لگی۔اب پھر ملا اسے مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے جمعہ کی تعطیل میں بدلنے پر بہ ضد ہیں۔دیکھئے ہماری جمعہ پارٹی جو اتوار پارٹی بن گئی تھی کب مشرف بہ اسلام ہو کر پھر جمعہ پارٹی بن جائے۔ ہم تو ملّا نہیں۔ہمیں آم کھانے سے غرض ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔ ماشااللہ۔

نہ جانے کتنے سال بعد اچانک **نوکیں دور** کچھ عرصے کے لیے بند ہوا۔ مگر خوش قسمتی ہے کہ بہت جلد اس کا نعم البدل زیادہ بہتر اور خوبصورت انداز میں ماہتاک **''سنگت''** کے نام سے شائع ہونے لگا۔ اور میں ''لٹ خانہ'' چھپواتا رہا۔ **''سنگت''** بھی بہت پیارا نام ہے۔ اور ہمارے ایک قلندر ساتھی رؤف وارثی کی یادگار ہے۔ ماہنامہ **''طلوع''** جو سوویت انفارمیشن ادارے کا پرچہ تھا، اس ادارے میں رؤف وارثی صاحب سے دوستی ہوئی۔ کیا ہی اچھے دن تھے اور کیا ہی اچھے انسان تھے۔

رؤف صاحب نے ملازمت چھوڑ کر غوث بخش بیزنجو صاحب کی گورنری اور زیرسرپرستی میں کوئٹہ سے **''سنگت''** نکالنا شروع کیا۔ وہ خود ترقی پسند اور کمیٹڈ انسان تھے۔ کچھ ایسا ہی پرچہ نکالتے تھے۔ جب بیزنجو صاحب اور ان کی نیپ کی حکومت ختم ہوئی تو پولیس وارثی صاحب کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ وہ روپوش ہو کر خلیج پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے افغانستان پھر جرمنی اور پھر سٹاک ہوم، سویڈن پہنچ گئے۔ اب وہیں کے ہو گئے۔

میری خوش قسمتی کہ میں سٹاک ہام پہنچا اور دوسرے ہی روز وہ بے قراری میں مجھے اپنے گھر منتقل کرنے کے لیے میرے دوست کے گھر پہنچے اور مجھے لے گئے۔ کچھ دن جو میری زندگی کے اچھے دنوں میں سے ہیں، میں نے رؤف صاحب، ان کی مہربان بیوی اور پیارے بچوں کے ساتھ گزارے۔ سدا زندہ ہوں، ایسے انسان دوست قلندر۔

تو شاہ محمد مری اور ان کے سنگتوں نے صرف **سنگت** نکالنے پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ اس انسانی وابستگی اور رشتہ کو پھیلانے میں جدوجہد کی اور اسے کراچی، لاہور، پشاور تک پھیلایا۔ جہاں کہیں انہیں ہم فکر اور کمیٹڈ انسان ملے ان سے رشتہ جوڑا۔ اب ماشا اللہ ان کی جدوجہد نے ثمر بخشی اختیار کی۔ بارآور ہو کر پھل دے رہی ہے۔ باشعور اور انسان دوستوں نے اشتراک عمل کر کے **سنگت** اور اس کے گروہ سے سنگتی جوڑ لی ہے۔ کچھ نیک بختوں کو یہ عمل پسند نہیں۔ اور انہوں نے ''غوغائے.....'' کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مگر ''رزقِ گدا'' کم نہیں

کیا جا سکتا۔ انسان دوستی اور کمٹمنٹ ہمیشہ جاری اور زندہ رہے گی۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ زندگی اہلِ دانش کے لیے اس لیے قابلِ قبول ہے کہ وہ انسانوں کی بھلائی کے لیے رہے۔

زندگی جوئے روان است روان خواهد بود
این مئے کهنه جوان است وجوان خواهد بود

(اقبال)

شاہ محمد، ڈاکٹر امیر الدین، شیام کمار، پروفیسر برکت علی اور سرور خان نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا۔

اس سنگتی سے پہلے ہم دوستوں کے تعلقات کراچی کے ترقی پسندوں اور دانش وروں سے مرحوم عظیم دانش ور سبط حسن کی وجہ سے استوار ہوئے تھے۔ سبط حسن، فیض احمد فیض اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان اور ہندوستان کے اہلِ قلم، شعرا، اور دانش وروں کو یک جا اور متحد کرنے کی زندگی بھر کوشش کی تھی۔ سبط حسن نے 1985 کی (انجمن کی) کراچی گولڈن جوبلی کا اہتمام کیا اور پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں اور دانش وروں کی نہایت کامیابی سے سہ روزہ کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں ترقی پسند فکر رکھنے والے، مزدور، کسان، خواتین، طلبا، شعرا، ادیب اور بوڑھے جوان سب شریک ہوئے تھے۔

سبط حسن اور ان کے دوست چوں کہ برسہابرس سے اس فکر کے لیے جدوجہد کرتے رہے تھے، اس لیے انہیں ہر صوبہ اور شہر کے ادیبوں سے واسطہ رہا تھا۔ سبط حسن صاحب کو بلوچستان میں بھی سب جانتے تھے۔ ان کی علمی کاوشوں اور تحریروں نے ترقی پسند ادیبوں اور لکھاریوں کے علاوہ، طلبا اور مزدوروں میں بہت اہمیت حاصل کی تھی۔ ان کی

کتابیں **ماضی کے مراز، موسیٰ سے مارکس تک، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، نوید فکر**، تو بے حد مقبول تھیں۔

چنانچہ جب کراچی کی گولڈن جوبلی کانفرنس کی خبر اور جناب سبط حسن کے نمائندے بلوچستان پہنچے تو سب نے لبیک کہا۔ کراچی سے جناب راحت سعید اور شمس الدین جناب ڈاکٹر امیر الدین کے پاس آئے جوان دنوں محکمہ تعلیم میں ایک پروجیکٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ راحت سعید کے بہت پہلے سے دوست اور ہم فکر تھے۔ سید شمس الدین ان کے ہم فکر ہونے کے علاوہ امیر الدین صاحب کے چچازاد بھائی تھے۔

سبط حسن صاحب کو تو انجم قزلباش کی وجہ سے پہلے ہی **لٹ خانہ** کے بارے میں معلوم تھا۔ انجم قزلباش کی بیماری کا بھی پتہ تھا۔ چنانچہ امیر الدین صاحب ایک روز اچانک یونیورسٹی میرے گھر سبط صاحب کے ان نمائندوں کے ہمراہ پہنچے۔ سید امیر الدین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے اپنے آنے کی غرض غایت بیان کی اور گولڈن جوبلی کانفرنس کا مژدہِ جاں فزا سنایا تو میں بے قرار ہوا۔ فوراً شرکت کے لیے تیاریاں شروع ہوئیں۔ قریبی رفیق پروفیسر بہادر خان رودینی اور پروفیسر برکت علی صاحب تھے۔ ان سے اس کانفرنس اور سبط حسن صاحب کے بلاوے کے بارے میں بات کی۔ تو وہ مجھ سے بھی زیادہ برجستہ اور آمادہ نظر آئے۔

سید امیر الدین سے تو اب صبح وشام رابطہ رہتا۔ وہ تو تھے ہی پارہ صفت انسان۔ ہمہ جہت بیدار اور نیکی اور نیک کام کے لیے دائم تیار انسان۔ ہم نے اپنے ایک اور دوست شیام کمار سے بھی رابطہ کیا وہ تو ہر وقت اسی فکر کے پرستار اور اسی کے لیے برسرِ پیکار رہتے۔

جناب ڈاکٹر شاہ محمد سے دوستی اور میری اپنی فکری وابستگی تو پہلے ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں صوبہ سے باہر تھے، اس لیے ان سے رابطہ نہ کر سکے۔

روز ہماری میٹنگیں ہوتی تھیں۔ اس وقت جعفر خان اچکزئی بھی ہم سے قریب تھے، وہ بھی شرکت کے لیے آمادہ ہوئے۔ ملک عثمان کاسی تو ایسے انسان تھے کہ نیک کام کے لیے صرف ان سے کہا جاتا تو وہ سب سے زیادہ مصروف عمل ہو جاتے۔

چنانچہ صادق شہید لائبریری کاسی روڈ میں واقع مقام پر ہر وقت میٹنگیں ہوتیں۔ فیصلہ ہوا کہ جعفر خان اچکزئی ہماری صدارت قبول کریں جو انہوں نے فوراً کی۔ اور شیام کمار صاحب کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا جو ہر لحاظ سے اس کام کے لیے موزوں سمجھے گئے۔ اس تنظیم کو بلوچستان ترقی پسندوں کی انجمن کا نام دیا گیا۔

اگر چہ ہر لحاظ سے ملک محمد عثمان اور سید امیر الدین صاحب کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ اور بے قرار تھے۔ مگر مجھے اور جعفر خان اچکزئی کو کراچی جانے کے لیے کہا گیا تا کہ سبطِ صاحب اور ان کے ساتھیوں سے مل کر کانفرنس کی تفصیلات معلوم کر کے رپورٹ دیں۔

چنانچہ جعفر خان اور میں کراچی گئے۔ وہاں سب سے پہلے ہماری ملاقات بندر روڈ کی ایک گلی میں ایک پیچیدہ مکان میں مسلم شمیم جو گولڈن جوبلی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری تھے، کا دفتر واقع تھا۔ مسلم شمیم صاحب کراچی ہائی کورٹ اور بار کے نام آور وکیل اور ممبر تھے۔ مسلم شمیم صاحب کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ ہم تو برسوں پہلے ایک دوسرے کے دوست اور ایک ہی ادارہ **طلوع** کے دفتر میں ہمکار رہے تھے۔ شمیم صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ مجھے اور جعفر خان کو فوراً بس میں بٹھا کر قمر ہاؤس لے گئے۔ وہاں سبطے صاحب کا دفتر تھا۔ وہ ایک مشہور انشورنس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ کام بس اپنا ہی کرتے۔ سب ان کے مرید تھے۔ **دانیال** (پبلشر) والے ان کی کتابیں چھاپتے۔ سبطے صاحب کو تو میں 1950 سے جانتا تھا۔ **لیل ونہار** اور **امروز** کے ذریعہ اور انجم قزلباش ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔

چنانچہ کانفرنس کے بارے میں پوری معلومات لے کر کے ہم کوئٹہ لوٹے اور صادق شہید لائبریری کی میٹنگ میں دوستوں کو سب کچھ بتایا۔ یوں کانفرنس میں شرکت کے لیے تیاریاں شروع ہوئیں۔ یہاں نظیر نیشاپوری کا شعر یاد آ رہا ہے۔

ترجمہ:

ہمارے جنگل میں بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہیں
جو لکڑی مسجد کی رکن نہ بن سکے، اسے ہم صلیب بنا لیتے ہیں

کوئٹہ سے بلوچستان کا ایک بڑا ڈیلیگیشن تیار ہو رہا تھا۔ اس کے لیے ایک پوری بس کرایہ پر لینی تھی۔ جانے اور آنے کا کرایہ دینا تھا۔ ملک عثمان نے کرایہ کا انتظام کرنے کی ذمہ داری۔ اور چندہ شروع کیا۔ اس میں سب سے زیادہ بندوبست (چندہ کا) ہائی کورٹ کوئٹہ کے مشہور وکیل اور انسانی حقوق کے علم بردار جناب سید امیر الدین کے دوست اور ہمکار جناب طاہر محمد خان مرزا نے کیا۔ انہوں نے بہت خوشی اور دلچسپی سے یہ کام کیا۔ خود ادیب اور ترقی پسند ہونے کے ناطے کانفرنس کے انعقاد میں سرگرم رہے۔ ان کے علاوہ ٹھیکہ دار عبداللہ جان کاسی، میر محمد ابراہیم خان ریکی اور ملک عثمان کے جان پہچان کی دیگر سیاسی اور مخیّر کاروباری شخصیات نے کی۔ ملک عثمان جہاں بھی گئے، لوگوں نے خوشی سے چندہ دے کر اعانت کی۔ پروفیسر بہادر خان، شیام کمار، میں اور جعفر خان اپنے خرچے سے کوسٹر میں گئے۔ امیر الدین اپنی کار میں۔ ڈیلیگیشن میں طلبا، مزدور اور سیاسی کارکنوں کی بڑی تعداد تھی۔

بلوچستان سے پہلی مرتبہ ایک ترقی پسند طالبہ زینت نے جواب بلوچستان یونیوسٹی کی محترمہ میڈم زینت ثنا کے نام سے جانی پہچانی استاد ہیں، پروفیسر ہیں اور شعبہ بلوچی زبان و ادب کی چیئر پرسن ہیں، ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی کانفرنس کی تین روزہ کانفرنس میں

بڑی حوصلہ مندی اور دلیری سے بلوچستان کی خواتین کی نمائندگی کی۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ضیا الحق کے مارشل لا کے ظلمت کے دنوں میں بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر بریگیڈئر آغا سید اکبر شاہ تھے۔ پروفیسر بہادر خان اور میں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے اجازت لینا ضروری جانا۔ ویسے بھی ترقی پسندوں کو حکومت ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتی رہی تھی۔ مگر آغا اکبر شاہ صاحب فوجی ہونے کے باوجود نہایت روشن خیال اور ادب دوست انسان تھے۔ ہمیں بہت ہی کھلے دل سے اپنی زبانوں کی نمائندگی کرنے کی اجازت دی۔

3

کراچی پہنچ کر ہم نے گولڈن جوبلی کے سیکرٹری جناب مسلم شمیم سے رابطہ کیا۔ چوں کہ اس وقت کانفرنس کے منتظمین میں سے ہمارا رابطہ مسلم شمیم صاحب اور مظہر جمیل سے تھا۔ مظہر جمیل سے میری واقفیت برسوں پہلے سکھر میں ہوئی تھی۔ جب وہ کالج کے طالب علم تھے اور وہ چوں کہ ڈاکٹر اعزاز نذیر صاحب کے سالے تھے، ان سے واقفیت پرانی تھی۔ اب مظہر جمیل یو بی ایل بینک کے نائب صدر تھے اور مسلم شمیم کے ساتھ مل کر محترم سبط حسن کے ساتھ بڑھ چڑھ کر کانفرنس کے لیے شب و روز محنت کر رہے تھے۔

ہم پہلے کینٹ سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل لے جائے گئے۔ جہاں پنجاب کے متعدد مندوبین کا قیام تھا۔ وہاں کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ مرحوم عبداللہ ملک سے ملے۔ پھر کئی اور محترم مشہور ادیبوں سے ملے۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ صبح دس بجے کراچی پریس کلب جا کر ہم بلوچستان کے تمام مندوب اپنی رجسٹریشن کرالیں۔

رات کو ہمیں جہازوں کے ایک ٹریولنگ ایجنٹ کے دفتر میں ٹھہرایا گیا۔ میں، جعفر خان، شیام کمار اور ایک دو اور دوستوں کے لیے رات رہنے کا وہاں انتظام کیا گیا تھا۔

رات گزارنے کے بعد حسبِ ہدایت ہم صبح کراچی پریس کلب جو ہماری قیام گاہ کے قریب تھا، پیدل گئے۔ کراچی پریس کلب میرے لیے بہت ہی متبرک مقام ہے، کیوں کہ یہاں بہت ہی اہم علمی ادبی، سیاسی تقاریب ہوتی رہتی ہیں اور میں نے اس سے قبل کئی تقاریب میں شرکت کی تھی۔

ویسے بھی سبطے صاحب نے حیدرآباد دکن کو 'شہر نگاراں' کہا تھا۔ اور اس پر بہت ہی خوب صورت کتاب لکھ دی ہے، جو ایک طرح سے ترقی پسند ادیبوں کے لیے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ میرے لیے کراچی ''شہر نگاراں'' ہے۔ مگر میں ایسی کتاب لکھنے کے قابل نہیں۔

میرے فکری، علمی اور مہربان قدردان دوستوں کا مرکز یہی کراچی رہا ہے۔ ویسے بھی بلوچستان والوں کے لیے کوئٹہ کے بعد کراچی ہر لحاظ سے ہمیشہ مرکز رہا ہے۔

صبح جب کراچی پریس کلب پہنچے تو ہم سے پہلے ہی ہمارے دیگر ساتھی جو کوئٹہ سے بس کرایہ کر کے آئے تھے، موجودہ تھے۔ انہوں نے رات سبزی منڈی کے قریب کوئٹہ کے ایک مہربان کاروباری شخصیت کے انتظام سے قیام کیا تھا اور وہیں رات گزاری تھی۔ جب تک کانفرنس میں شرکت کرتے رہے تو ان میں بہت سارے بلوچستانی مندوبین کا قیام یہیں رہا۔ ڈاکٹر خدائیداد صاحب انہی کے ساتھ تھے۔

صبح جب رجسٹریشن کرانے پریس کلب آئے تو میں سب سے پہلے خوب صورت وخوب سیرت باکمال ہنرمند خاتون فریال گوہر سے ملا۔ وہ رجسٹریشن کروانے آئی تھیں۔ فریال اس وقت بلوچستان یونیورسٹی کے نئے شعبہ فائن آرٹس کی استاد تھیں اور ان کے ذہین اور بہت ہی قابل آرٹسٹ شوہر جناب جمال شاہ اور ان کے دوسرے دو ویسے ہی باکمال

آرٹسٹ اکرم دوست اور کلیم خان نے بلوچستان یونیورسٹی میں محترم برگیڈئر آغا اکبر شاہ کی علم دوستی اور ہنر پروری اور مدد سے شعبہ فائن آرٹس کھولا تھا۔ جمال شاہ اور فریال گوہر نے کوئٹہ میں فن اور ہنر کو بہت ہی وسعت دی اور ان کے قابل ہم کاروں نے جو سب کے سب لاہور کے مشہور اور پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ نیشنل کالج آف آرٹس کے گریجویٹ تھے، ان کے استاد بہت ہی نامی گرامی عزت اور شہرت کے مالک ہیں اور ان میں سے نہایت ہی مہربان اور معزز و محترم فیض صاحب کی بیٹی سلیمہ ہاشمی ہیں، جنہیں ہم سب جانتے ہیں۔

فریال نے بہت ہی محبت اور عزت سے ہاتھ ملایا (جس سے اکثر پاکستان کی لکھی پڑھی خواتین کتراتی ہیں) اور میں نے بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح پیار کیا اور عزت دی۔

فریال سے فارغ ہوا تو قریب ہی سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک قوی ہیکل سیاہ فام خوب صورت انسان آگے بڑھے اور مجھے تپاک سے ملے۔ مگر اس محترم انسان نے بالکل یہ گمان ہی نہ دیا کہ وہ مجھ سے نا آشنا ہیں یا میں ان سے ناواقف ہوں۔ ان کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ مجھے اپنے قریب کرسی پر بٹھاتے ہوئے اپنی کتاب پیش کی۔ اور کہا یہ میری کتاب آپ کی نذر ہو۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ برسوں سے مجھے جانتے تھے۔ نہایت ہی بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ کتاب پر ان کا نام لکھا تھا۔ اب کتاب کا ٹائٹیل مجھے یاد نہیں۔ نام محمد علی صدیقی لکھا تھا۔

بہت بعد میں پتہ چلا کہ یہ صاحب محمد علی صدیقی ہیں اور **ڈان** کے مشہور کالم نویس Ariel ہیں۔ ایرائیل کے نام سے تو میں بہت پہلے واقف تھا۔ اور **ڈان** میں ہمیشہ میں ان کی اور زینو کی تحریر بہت دلچسپی سے پڑھا کرتا رہا تھا۔ وہ بہت عالم اور ذہین اور ترقی پسند اور انسان دوست لکھاری تھے میرے لیے۔ زینو سے بھی بعد میں اسلام آباد میں کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔

پتہ چلا کہ وہ مشہور ترقی پسند نامی گرامی ادیب اور دانش ور، علم دوست، انسان

دوست صفدر میر ہیں جنہوں نے کشور ناہید، اور قاضی جاوید سے مل کر یافروایشائی ادیبوں کی انجمن پاکستان میں بنانے کی کوشش کی تھی، اور مجھے اس میں بہ حیثیت بلوچ ادیب کے شریک ہونے کی دعوت دی تھی۔ میں نے تو بہ صد شوق شامل ہونے کے لیے خط کا جواب دیا تھا۔ اور ان کے کہنے کے مطابق سو روپیہ شرکت کی فیس بھی بھیج دی تھی۔ مگر پھر اس انجمن کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

زینو بھی ایرئیل کی طرح بہت بلند قامت اور حسین انسان تھے اور بہت ہی خاموش طبع۔

محمد علی صدیقی سے تو ازاں بعد بہت ہی دوستی ہوئی۔ ان میں اور ان کی شخصیت میں مقناطیسی طلسم ہے جو ادیبوں اور انسانوں کو کھینچ لیتا ہے۔

بعد میں ہمیں بتایا گیا کہ شام پانچ بجے پریس کلب میں کانفرنس کی افتتاحی نشست ہوگی۔ بہت بڑا اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ اس کے آگے مندوبین اور سامعین کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔

دن کا باقی حصہ جوں توں گزار لیا۔ ہم کانفرنس میں شرکت کے لیے بے چین تھے۔ چنانچہ پانچ بجے پریس کلب پہنچ گئے۔ تو وہاں پہلے ہی ایک جم غفیر موجود تھا۔ جب کانفرنس کی افتتاحی نشست کی ابتدا ہوئی تو ہمیں سٹیج پر بہ حیثیت مہمانانِ خصوصی پریزیڈم پر بٹھایا گیا۔ میں، پروفیسر بہادر خان اور جعفر خان اچکزئی' محترم کامریڈ سوبھو گیان چندانی اور کئی صاحبان، جن میں شوکت صدیقی اور کئی اور صاحبان موجود تھے، مجھے اب یاد نہیں۔

مہمانوں اور مندوبین کو خوش آمدید کہنے کے لیے کانفرنس سیکرٹری جنرل جناب مسلم شمیم پہلے ہی سٹیج پر موجود تھے۔ انہوں نے بہت ہی محبت اور عزت اور احترام سے مندوبین کو خطاب کیا۔ پھر مختلف زبانوں اور صوبوں کے نمائندوں نے سیشن کو پڑھ کر خطاب کیا۔ بلوچستان کی نمائندگی جعفر خان اچکزئی نے بہت ہی خوب صورت اور دلچسپ انداز

میں مضمون پڑھ کر کی اور سامعین کو خوب ہنسایا۔

سندھ اور سندھی کی نمائندگی کا مریڈ سوبھو گیان نے کی جو سب کے لیے قابلِ احترام تھے۔ پنجاب اور پنجابی کی نمائندگی افضل رندھاوا صاحب نے اپنی بڑی مونچھوں سے کی۔ سرحد اور پشتو کی نمائندگی میرے پیارے دوست سلیم راز نے شاید پڑھ کر کی۔ جو وقت سے پہلے گنجے ہو گئے تھے۔ اردو کی نمائندگی **خدا کی بستی** کے خالق محترم جناب شوکت صدیقی نے کی۔ یاد نہیں اس سیشن کو جناب سبطِ حسن نے خطاب کیا یا نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ پاکستان کے نہایت ہی محترم استاد، دانش ور، بلوچستان یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور میر غوث بخش بزنجو کے مداح اور قریبی دوست کرار حسین صاحب نے خطاب کیا۔ بزنجو صاحب نے گورنر ہوتے اور بلوچستان میں یونیورسٹی بنتے ہی جناب کرار صاحب کو وائس چانسلر بنا کر بلوایا۔ کرار صاحب کے مشورے سے کئی اور لائق وقابل اساتذہ بلوائے۔ جن میں ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر شمیم احمد اور پروفیسر صہبا انصاری، لائبریرین جناب علی کاظمی کو بلوایا تھا۔ کرار حسین صاحب نے نہایت پیار، انسان دوستی اور محبت سے خطاب کیا۔ ترقی پسندوں سے اپنی وابستگی اور پختہ دوستی کا اظہار کیا۔ آخر وہ تھے ہی ملا صدرا کے پیروکار جو مشہور ایرانی فلسفی، ترقی پسند، انسان دوست، صوفی تھے۔

پتہ چلا کہ ترقی پسند دانش وروں میں کرار حسین صاحب کی بڑی عزت اور پذیرائی تھی۔ اسٹیج کے سامنے روم سینٹ کے ممبران کی طرح کئی عالم، فاضل، ترقی پسند، انسان دوست بزرگ حضرات بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ہی کئی پیران سر بزرگ خواتین سفید ساڑھیوں اور قمیص شلوار میں ملبوس عالم فاضل، ترقی پسند اور باکمال و ہنر مند انسان، خواتین کی بھیڑ تھی۔ ان میں فیض صاحب کی ساتھی اور دوست بیگم مجید ملک صاحبہ اور زہرا نگاہ بیٹھی تھیں۔ یقیناً ان کی باکمال ہمشیرہ فاطمہ ثریا بجیا اور بھائی انور مقصود بھی وہیں اجلاس میں موجود ہوں گے۔ نیز اور کئی نام ور بزرگ، اس ذوق کے دانش ور موجود ہوں گے۔

نشست کے وقفہ میں کراچی پریس کلب نے سب کے لیے ظہرانہ (ٹی پارٹی) کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ ظہرانہ میں شرکت کر کے تازہ دم ہوئے اور پھر اس پر وقار تقریب میں شامل ہوئے۔

اب ہم باہر کھڑے ہوئے بغیر یعنی کرسیوں پر نہیں بیٹھے بلکہ آس پاس گھومتے رہے۔ کچھ بہت پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ جن میں ڈاکٹر ہاشمی صاحب اور ان کے احباب ملے اور بہت خوش ہوئے۔ ساتھ ہی خواتین کا گروہ تھا، جو کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ اس میں ڈاکٹر اعزاز نذیر صاحب کی بیگم، ان کی بیٹی، محترمہ حمزہ بشیر صاحبہ اور کئی نام ور باکمال، انسان دوست، ترقی پسند دانش ور خواتین اور بچیاں کھڑی تھیں۔

حمزہ نے اپنے بھائی اور ہمارے بہت قریبی دوست حسن ناصر اور سوبھو صاحب کے ساتھی شرف علی مرحوم کی یاد دلا دی۔

یہ سبطِ حسن کا کرشمہ تھا اور ان کے اچھے ساتھیوں کی ہمت تھی کہ ملک کے طول عرض سے اتنے اچھے انسانوں کو یک جا کر لیا تھا۔

4

صبح دس بجے میٹروپول ہوٹل کے عقبی چھوٹے دروازے سے جو ایمپریس کافی ہاؤس کے برابر سے کھلتا ہے، اندر داخل ہوئے۔ ساتھ ہی ہوٹل کا کانفرنس ہال تھا، پہلے ہی سے لوگ وہاں جمع تھے۔

جب اس نشست کی کارروائی شروع ہوئی تو اسٹیج پر کئی معتبر اور بزرگ ادیب جلوہ افروز تھے اور کچھ ہندوستان کے مہمان ادیب پہنچے تھے۔ ان کے نام معلوم ہوئے: غلام رسول تابان، شاید اختر الایمان اور انجینئر اصغر علی اور ایک ہندو مشہور ادیب شاید پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے۔ اور بھی ہوں گے، یاد نہیں۔ بتایا گیا کہ کئی اور مشہور ادیب ہندوستان سے شرکت کے لیے آنا چاہتے تھے مگر سفارتی قوانین اور ویزہ کی پابندی کی وجہ سے نہ آ سکے۔

شوکت صدیقی، حسن عابدی، واحد بشیر نظر آئے۔ پنجاب کے اہم ادیبوں میں سے ظہیر کاشمیری، حبیب جالب، اور عبداللہ ملک صاحب کے نام سنے۔ حمید اختر صاحب بھی

ضرور لاہور سے تشریف لائے ہوں گے مگر ان کا نام نہیں سنا۔

کانفرنس کی کارروائی کے دوران بلوچستان کے کچھ اور ادبا اور ترقی پسند فکر کے حامی جناب ڈاکٹر نعمت اللہ گچکی صاحب، جناب طاہر محمد خان، حاجی عبدالرحمان شاہوانی صاحب ایک اور ملک صاحب (نام یاد نہیں) لورالائی سے محترم و مرحوم سید امیر الدین کے دوست ان کی دعوت پر کوئٹہ سے آئے تھے۔ اسی طرح جناب پروفیسر دشت یاری صاحب بھی باقاعدہ شرکت کے لیے موجود تھے۔ بلوچستان کے دو مزدور دانش ور اور ادیب جناب شاہ بیگ شیدا (براہوئی کے شاعر و ادیب) جناب کامریڈ فقیر محمد بلوچ بھی موجود تھے۔

لیاری کے بلوچ اور سندھی ادیبوں اور دانشوروں میں سے بہت سارے موجود تھے۔ رحیم بخش آزاد، لعل بخش رند، منصور بلوچ، گلاب بلوچ، محمد بیگ، مراد ساحر، یوسف نسکندی، سرفراز بلوچ، یار محمد یار۔ شاید جناب نور محمد شیخ اور ان کے ساتھی عوامی ادبی انجمن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ رؤف نظامانی صاحب بھی تھے۔ کئی اور دوست اور ادیب دانشور کوئٹہ کے کچھ احباب نظر آئے۔ بزرگ اور قابلِ احترام اعظم جان اچکزئی جو نام ور بلوچستانی ترقی پسند ادیب اور صحافی، سیاسی کارکن، عبدالصمد خان (کے بھانجے) اور یوسف مگسی کے شریکِ سیاست اسلم خان اچکزئی کے چھوٹے بھائی بھی موجود تھے۔ اعظم جان کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ انہیں تو اس وقت دیکھا تھا جب آٹھویں کلاس کے امتحان کے لیے میں کوئٹہ آیا تھا۔ یعنی 1938 میں۔ ان سے پہلی ملاقات ہفت روزہ **"استقلال"** کے دفتر میں ہوئی تھی۔ نہایت خوب صورت نوجوان اور مہذب انسان تھے۔ **استقلال** اور خان صمد خان کے پریس واقع پرنس روڈ میں کام کرتے تھے۔ دکھ اس لیے ہوا کہ ان کے نوجوان اور اسی طرح خوب صورت بیٹے اولس یار کو جناب محمود خان اچکزئی کے ہمراہ محترم سائیں حسن خان مندوخیل کے مکان میں دیکھا تھا۔

جناب محمود خان انہیں ساتھ لائے تھے اور میں حسن خان صاحب کے گھر جناب

عبدالرحیم مندوخیل سے ملنے گیا تھا اور ان کی کتاب **پشتونوں کی تاریخ** کو دیکھنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ بعد میں یہی پھول جیسا بچہ ظالم پولیس والوں کے ہاتھ مسل دیا گیا۔ اس کا دکھ آج تک دل میں ہے۔

؎ حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے!

میں اور پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب اسلام آباد سے ادیبوں کی کانفرنس سے واپس آرہے تھے۔ ریل سے اتر کر یونیورسٹی کو جانے کے لیے رکشہ ڈھونڈ رہے تھے کہ یہ بری خبر سنی۔ بے حد دکھ ہمیں ہوا۔

کانفرنس میں پشاور سے آئے ہوئے محترم سلیم زار اور اُن کے ساتھی مظفر بیٹنی بھی ہال میں موجود تھے۔ دونوں پشتو کے نام ور ادیب اور ترقی پسند فکر کے شاعر اور دانش ور ہیں۔ یقیناً کئی ادیب اور دانش ور پشاور سے ان کے ہمراہ ہوں گے۔

یقیناً سندھی ادیب سبھی بہت زیادہ تھے۔ کچھ بزرگ مثلاً شمشیر الحیدری اور جمال ابڑو جنہیں میں جانتا تھا، نوجوان سندھی ترقی پسند اور دانش ور بہت تھے، جنہیں جانتا تھا۔ ان میں فقیر محمد لاشاری (مرحوم) اور انور پیرزادہ تھے۔ کانفرنس میں کئی سندھی نوجوان ادیبوں نے سندھی ترقی پسند ادب پر اچھے مقالے پڑھے۔ جن میں سے جمال ابڑو کے بیٹے بدر ابڑو اور بدر اجن کے نام یاد آرہے ہیں۔ ہال میں نہایت ہی محترم ترقی پسند جناب ملک شمیم بھی لاہور سے آئے تھے۔

کامریڈ سوبھو گیان چندانی تو کانفرنس میں ترقی پسند ادب اور دانش وری کی نمایاں شخصیت تھے۔ ظہیر کاشمیری کے پرانے ساتھی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ساتھ نظر آتے رہے۔

اس سیشن میں ہندوستانی ادیبوں نے مقالے پڑھے اور سامعین کو خطاب کیا۔

سب پرانے اور ترقی پسند ادیبوں کے مشہور اور نام ور دانش ور تھے، جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو ترقی دی تھی اور جناب سبطِ حسن صاحب کے ہم فکر اور ہم نوا تھے۔

اصغر علی انجینئر نے انگریزی میں مقالہ پڑھا۔ ان کے مقالے کی کانفرنس میں بہت پذیرائی ہوئی اور اکثر لوگوں سے اس مقالہ کی تعریف سنی۔ اصغر علی سے بلوچستان ڈیلیگیشن اور ادیبوں کے صدر جناب جعفر خان اچکزئی کی بڑی دوستی ہوئی اور ملاقاتیں ہوئیں۔ جعفر خان نے اپنی کتاب **''سوالاً جواباً''** جس کی کئی جلدیں ان کے پاس تھیں، اصغر علی کو پیش کیں۔ اور دوسرے ہندوستانی ادیبوں کو بھی۔

بلوچستان کے ڈیلیگیشن میں مزدوروں اور طلبا نے زیادہ شرکت کی۔ ڈیلیگیشن میں بیشتر مزدور اور ڈی ایس ایف (ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن) کی نمائندگی تھی۔ پی ایس او (پشتون اسٹوڈنٹس آرگنائیزیشن) اور پی ایس ایف (پشتون اسٹوڈنٹس فیڈریشن) کی بھی خاصی نمائندگی تھی۔

بلوچستان کی اس شرکت سے ڈیلی گیشن اور ترقی پسند وادیبوں کے صدر جعفر خان اچکزئی، اور سیکرٹری جنرل شیام کمار اور سید امیر الدین بہت خوش تھے۔

گولڈن جوبلی کی کامیابی کا سہرا جناب سبطِ حسن اور ان کے ہمکار جنرل سیکرٹری مسلم شمیم، مظہر جمیل، راحت سعید، واحد بشیر، سید شمس الدین کے سر تھا۔ ملک کے دیگر ترقی پسند ادیبوں نے گولڈن جوبلی کو کامیاب بنانے میں بہت محنت کی تھی۔

ایک تو سبطِ حسن کی کتابوں اور ترقی پسند ادب کو ترقی دینے میں مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا کہ یہ نوجوان ادیبوں اور دانش وروں کو آگہی دینے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی تھیں اور نوجوانوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ بلوچستان کے طلبا اور نوجوان ان کی کتابیں کوئٹہ بک اسٹالوں پر پہنچتے ہی خرید لیتے۔ اس وقت سبطِ حسن صاحب گولڈن جوبلی کانفرنس کے چشم و چراغ معلوم ہو رہے تھے۔

کانفرنس میں ایک بہت ہی پرانے نحیف ونزار ترقی پسند صحافی جناب صہبا لکھنوی، معروف ماہنامہ **افکار** کے مدیر سے ملاقات ہوئی ۔ صہبا صاحب سے جون 1956 میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے بڑے بھائی اور بلوچی کے مشہور ترقی پسند شاعر ادیب اور صحافی آزاد جمالدینی کے پکے دوست تھے۔ کراچی ہم اکثر ان کے دفتر جاتے جو عیدگاہ بندر روڈ کے قریب واقع تھا۔ میں، خدائیداد، انجم، زمرد حسین جو بھی کراچی جاتا، ان سے ملنے ضرور جاتا۔ **افکار** ہی میں روزنامہ **امروز** کے بعد آزاد جمالدینی صاحب کے اشعار کے اردو ترجمے جناب عین سلام اور انجم قزلباش کر کے بھیجتے تھے۔ صہبا صاحب کی خدمات ترقی پسند شعرا، اور ادبا کی تخلیقات کو پیش کر کے بہت زیادہ ہیں ۔ وہ اکثر خاص نمبر اور ایڈیشن نکالا کرتے رہے ہیں۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب ان کے بے حد پرستار اور ثنا خوان تھے۔ بلوچستان یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ کو وہ مجتبیٰ صاحب کے لیے ہمیشہ پرچہ بھیجا کرتے رہے۔ لہٰذا جب میں یونیورسٹی سے وابستہ ہوا، تو پرچہ لینے کے لیے مجتبیٰ صاحب کے پاس جاتا۔

ویسے آزاد صاحب کا دفتر جولی مارکیٹ میں واقع تھا۔ وہاں کئی نام ور ہستیوں سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ صہبا صاحب، مولوی عبدالواحد سندھی (بی بی سی کے آصف جیلانی کے والد)، وہ **زندگی** کے ایڈیٹر تھے۔ پیر محمد شارک **اباسین** پشتو کے مدیر تھے۔ انور احسن صدیقی طلبا کا مجلّہ **لوح وقلم** کے ایڈیٹر تھے۔ اور کئی حضرات سے یہیں ملاقات ہوئی۔ یوں بھی آزاد کے ماہنامہ **بلوچی** کا دفتر مختلف زبانوں کے ادیبوں شاعروں اور دانش وروں کا اڈہ تھا۔ پھر لی مارکیٹ کو لیاری کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ جو بھی لیاری جاتا، یہیں سے ہو کر گزرتا۔ اہلِ علم ودانش، فن وادب کے لوگ آزاد سے ملنے کے لیے ضرور رک جاتے۔

بلوچی کے ادبا بشیر بلوچ صاحب، ان کے بھائی ڈاکٹر موسیٰ مرحوم، ڈاکٹر ڈی کے ریاض، جمعہ خان بلوچ، یوسف سکندری، مرحوم قاسم ہوت، حکیم احمد بلوچ، ان کے ہر وقت کے ساتھی اکبر بارک زئی کے ماموں محمد مراد بلوچ، مولانا خیر محمد ندوی، مرحوم مراد آوارانی،

عبدالصمد امیری، اکبر بارک زئی، مراد ساحر، احمد ظہیر، کس کس کو یاد کیا جائے۔

بلوچی کے نہایت ہی قابل اور نام ور فن کار عطا شاد کے ساتھی (جب وہ ادارہ ثقافت میں ڈائریکٹر تھے) سرفراز بلوچ نے لیاری کا دروازہ کے نام سے ایک بہت بلند پائے کا اسٹیج ڈرامہ چاکی واڑہ کے چوک کے پاس لیاری لیبر ہال میں پیش کیا تھا۔ اس ڈرامہ کے کی صدارت اور مہمان خصوصی کے لیے جناب فیض احمد اور جناب محمد حسین عطا کو دعوت دی گئی تھی۔ فیض صاحب تو کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکے۔ عطا صاحب موجود تھے۔ میں بھی تھا، یوسف سکندری بھی اور میرے خیال میں سید ہاشمی صاحب بھی کراچی آئے تھے، موجود تھے۔ ڈرامہ نہایت کامیاب اور پسند کیا گیا۔ یہ ڈرامہ لیاری میں منشیات کے خلاف تھا۔

مقصد اس طویل تحریر کا لیاری اور بلوچوں کی ترقی پسند ادب، شاعری، فنون سے وابستگی کا اظہار ہے۔ بلوچی کا ایک اور ادبی ڈرامہ ''شاہناز'' بھی اسی فکر کی تخلیق تھی جو کہ کراچی میں تخلیق ہوا اور کوئٹہ اور مستونگ میں اسٹیج ہوا۔ یہ مراد آوارانی کی تحریر تھا۔

گولڈن جوبلی کانفرنس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے اس میں انسان دوستی اور دانش وروں کے اشتراکِ عمل کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کراچی میں جہاں کہیں ترقی پسندی کی فکر کارگر تھی وہ اس کانفرنس کی مدد ومعاون تھی: صنعت، صحت، صحافت، مشقت (مزدوروں میں) غرض زندگی کے ہر شعبہ کو اس نے اپنے مقناطیسی عمل سے یک جا کیا تھا۔

صبح وشام میری اس فکر کی تائید ہو رہی تھی۔ کانفرنس کے مندوبین کے لنچ اور ڈنر انہی شعبوں کی پذیرائی کا نتیجہ تھے۔ وکلا، ڈاکٹر، صحافی اور صنعتی شعبے کے لوگ یہ فرائض انجام دے رہے تھے۔ کراچی کے صحافیوں نے پریس کلب میں، وکلا نے پاکستان آرٹس کونسل میں، ڈاکٹروں نے پی ایم اے ہاؤس میں اس عمل کا مظاہرہ کیا۔

ایک رات بہت بڑا مشاعرہ ہوا۔ دوسری رات ایک ڈرامہ بلکہ دو ڈرامے پیش کیے

گئے۔ایک پاکستان کی علمی اور فنی تاریخ میں نہایت ہی مقبول اور مشہور ڈرامہ باکمال اسلم اظہر نے مندوبین کے لیے مشہور سینما گھر ''ریو'' میں اسٹیج کیا۔ یہ گولڈن جوبلی کانفرنس کے شایانِ شان ڈرامہ 'گلیلیو گلی لی' کا ڈرامہ تھا۔اس میں اسلم اظہر اور اس کے ساتھی سعید اور ان کی پوری فیملی یہاں تک کہ چھوٹے بچوں نے ماں سمیت اپنے بہترین فن کا اظہار کیا تھا۔گلیلیو کو اس کی فکر اور سائنسی سچائی کو آشکار کرنے کی پاداش میں مذہبی اور ترقی کی دشمن قوتوں نے موت کی سزا تجویز کی تھی۔مگر آج وہ سچائی خود انہی قوتوں کے لیے ناگزیر ہوگئی ہے۔ارتقا اور ترقی کے دشمن ہمیشہ بالآخر یوں خوار و شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

لاہور کے مشہور تھیٹر اجوکا نے روشنیوں کے شہر اور فیض احمد فیض کی فکر و شاعری پر مبنی ایک ڈرامہ پیش کیا۔اس میں لاہور کے دیگر فن کاروں کے علاوہ بلوچستان یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ کی استاد فریال گوہر شامل تھیں۔اس سینما میں کبھی میں نے گرودیو ٹیگور کی کہانی پر مبنی فلم ''کابلی والا'' چند دوستوں کے ہمراہ دیکھی۔اس وقت مجھے یہ افسوس ہوا کہ اتنے عظیم عالمی شہرت کے ادیب اور فلسفی کی فکر کی کراچی میں پذیرائی نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ محض چند لوگ اس فلم کو دیکھنے کے لیے ہال میں موجود تھے۔مگر اب انتہائی ذہین ساور باکمال لوگ اسلم اظہر اور فریال گوہر اور ان کے ہم کاروں کے ڈراموں کو دیکھنے بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔سب شاعر، مفکر، دانش وراور اد با اور ادب دوست لوگ تھے۔

ان ڈراموں نے خصوصاً گلی لیو گلیلی نے دیکھنے والوں کو بہت ہی متاثر کیا۔

گولڈن جوبلی کا نشان عالمی شہرت کے ترقی پسند، امن دوست اور انسان دوست آرٹسٹ پکاسو کا 'امن کی فاختہ' تھا۔کیا ہی بلند و بالا فکر اور فن کا مظاہرہ اور بے حد ہی نایاب تخلیق ہے۔یہ امن کی فاختہ جس کی نازک چونچ میں زیتون کی ڈالی ہے۔آج پکاسو کی اس فکر کی انسان کو کس قدر ضرورت ہے۔اس فاختہ کی دانش ورانہ پذیرائی ہر وقت کانفرنس میں ہو رہی تھی۔

مسلم شمیم اور مظہر جمیل نے، جو کہ ہر وقت کانفرنس کو کامیاب بنانے میں مصروف عمل تھے، پاکستانی زبانوں میں ترقی پسند ادب کی مقبولیت اور ان زبانوں کے ادب، شاعری اور فنون پر اس کے اثرات کو معلوم کرنے کے لیے **''گفتگو''** کے نام سے ایک موٹی کتاب تیار کر لی۔نہ جانے کس وقت یہ کام اس قدر سرعت سے سرانجام پایا۔اس میں تمام زبانوں کے ادب کی نمائندگی تھی۔ مجھے باقی تو یاد نہیں۔اگر چہ کتاب اب بھی میرے کتاب خانہ میں موجود ہوگی، مگر کون اسے تلاش کرے۔مگر وہ نام مجھے یاد ہیں: ایک سوبھوگیان چندانی کا سندھی ادب پر اور دوسرا خود میرا بلوچی ادب پر۔ یہ ان نمائندہ ادیبوں کے اپنے ادب کے بارے میں انٹرویوز پر مبنی ہیں۔

ایک صبح **جنگ** کی طرف سے میر خلیل الرحمان مرحوم اور ان کے صحافی، ترقی پسندوں سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ان کے انٹرویو کانفرنس کے بارے میں اور تاثرات معلوم کرنے کے لیے۔تصویریں بھی لی گئی۔

کانفرنس کے خاتمے پر مندوبین کو سوونیئر (سوغات) ایک بیگ میں چند کتابوں کے ساتھ (جس میں 'گفتگو' کے علاوہ کانفرنس کی روداد کی کتاب اور چند اور) تقسیم ہوا۔ بیگ پر گولڈن جوبلی کا نام اور امن کی فاختہ کی تصویر، اس کی چونچ میں زیتون کی شاخ ڈالی دی گئی۔ہمیں بھی یہ سوغات ملی۔

ایک نہایت اہم کام جو گولڈن جوبلی کے اختتام پہ ہوا اور سبطِ حسن صاحب سے جدا ہونے کی تقریب، الوداعی دعوت کا ذکر بھول گیا ہوں۔ یہ دعوتِ الوداع زندگی بھر کی الوداعی دعوت ثابت ہوئی۔

ایک شام کو چند ادیبوں کو بلایا گیا اور ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔اسے کانفرنس کا اعلامیہ تیار کرنے کی کمیٹی کہا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا۔ جب میٹنگ میں پہنچا تو سامنے ایک سرخ و سفید، نہایت خوب صورت اور صحت مند نوجوان

بیٹھا تھا۔ میں انہیں ایک پشتون دانش ور سمجھا اور یہ خیال کیا کہ سرحد سے پشتو کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ میں نے پشتو میں ان سے بات شروع کی۔ وہ خاموش رہے۔ میں حیران ہوا۔ ایک صاحب نے تعارف کیا کہ بھائی یہ فخر زمان صاحب ہیں اور پنجابی زبان وادب کے نمائندہ ہیں۔ فخر زمان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد یہ ملاقات دوستی اور بردارانہ تعلقات میں بدل گئی۔ کمیٹی میں ایک صاحب پشتو کی نمائندگی کر رہے تھے، جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ ان کا تعلق سرحد سے تھا اور وہ کراچی میں رہائش رکھتے تھے۔ وہ کانفرنس میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے رہے تھے۔ سندھی کی نمائندگی سوبھوگیان چندانی کر رہے تھے۔ اردو کی واحد بشیر صاحب اور ان کے علاوہ ظہیر کاشمیری بھی کمیٹی میں موجود تھے۔ ہم نے مل کر اعلامیہ تیار کیا۔ جو کانفرنس کے اختتام پر سٹیج پر سنایا گیا۔ اس میں ظہیر کاشمیری، سوبھوگیان چندانی اور واحد بشیر کی محنت وفکر قابلِ تعریف تھے۔

اسی رات یا دوسری رات مسلم شمیم صاحب اور ان کے بھائی نے جو میرے بہت ہی مہربان دوست ہیں، مجھے اور چند دوستوں کو جو کانفرنس میں شامل رہے تھے، اپنے گھر نیو کراچی دعوت پہ بلایا تھا۔ مجھے شمیم صاحب کے بھائی نارتھ ناظم آباد سے اپنی کار میں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہیں کہیں پہلے ایک جگہ رکے تو معلوم ہوا کہ مظہر جمیل صاحب کا گھر تھا۔ انہیں شاید دعوت میں بلانے کے لیے مسلم شمیم کے بھائی نے گھر میں اطلاع کر دی۔ بعد میں پھر کہیں دور جا کر رکے تو گھنٹی بجانے پر محمد علی صدیقی بہ نفس نفیس باہر تشریف لائے۔ ہاتھ چہرے پر رکھا ہوا تھا اور چہرہ کچھ سوجھا ہوا تھا۔ بیماری کی وجہ سے دعوت میں شرکت سے معذرت کی۔ شمیم صاحب کے گھر پہنچے۔ تو رات کو ٹھیک یاد نہیں، پروفیسر بہادر خان رودینی جعفر خان اچکزئی، شیام کمار صاحب دعوت میں موجود تھے۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات پہ ہوئی کہ سبطِ حسن صاحب میرِ مجلس تھے۔

نہایت ہی پُر لطف دعوت سے محظوظ ہوئے۔ بہت ہی خوب صورت محفل تھی۔

کیوں نہ ہو، اس میں سبطِ حسن صاحب جو موجود تھے۔

کھانا کھا چکے تو بعد میں شمیم صاحب کے گھر امیر الدین صاحب، اسلم اظہر اور سعید صاحب بھی پہنچے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر یہ گروہ ہمیں کہیں اور کسی کے گھر لے گیا۔ میرے خیال میں شاید یہ گھر راحت سعید صاحب ہی کا ہوگا۔ اس وقت وہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ بہت ہی پُر لطف اور دل کو دماغ کو منور اور خوش کرنے والی محفل تھی۔

سبطِ حسن صاحب سے تو شمیم صاحب کے گھر رخصت لی تھی۔ کیا خبر تھی کہ چند ہی دن کے بعد ہندوستان میں ترقی پسندی کی کانفرنس کے دوران ان کا انتقال ہو جائے گا۔ (ہائے بے بختی!)۔

5

ترقی پسند ادیبوں کی گولڈن جوبلی کانفرنس اور سبطِ حسن کی وفات کے بعد اس سے متاثر ہو کر ترقی پسندوں نے عمل شروع کیا۔ اب یہ یاد نہیں کہ سبطِ حسن مرحوم کی تعزیتی تقریب تھی یا پہلی برسی۔ ان کے رفقا نے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ بلوچستان سے صرف مجھے اس میں شرکت کے لیے بلایا تھا۔ بلا وا میرے خیال میں حسن عابدی کے توسط سے موصول ہوا تھا۔ میں کراچی پہنچا اور حسبِ دستور میرا ٹھکانا گلاب جان بلوچ اور ان کی محترمہ والدہ کا گھر تھا۔ تقریب کے وقت مجھے گلاب جان اپنے سکوٹر پر کراچی پریس کلب لے گئے۔ کیوں کہ سیمینار وہیں منعقد ہو رہا تھا۔

کراچی پریس کلب پہنچا تو وہاں میری ملاقات حسن عابدی اور سبطِ حسن صاحب کی اکلوتی اولاد محترمہ شازیہ سے ہوئی۔ اور مجھے متعارف کرایا گیا۔ شازیہ پاکستانی خواتین کی روایات سے ہٹ کر جس میں صرف سلام ودعا ہوتی ہے، یک دم مجھے بغلگیر ہو کر ملیں۔

میرے لیے یہ حیران کن بات تھی۔

پاکستان میں بہت ہی باوقار اور روشن خیال خواتین سے میری خوش قسمتی سے ملاقات ہوئی جو یا تو ماں، بہن اور نہایت ہی مہربان عزیزہ کی طرح ملتی رہی ہیں یا پھر ہاتھ ملاتی رہی ہیں۔ شازیہ کے علاوہ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض سے اسی طرح ملاقات ہوتی رہی ہے۔ کشور ناہید تو بڑی بہن کی طرح ڈانٹتی بھی ہیں۔ اسی طرح افضل توصیف اور ہماری پیاری بچیاں سسٹر ثبینہ رفعت، نوشین قمبرانی بھی اسی طرح ملتی رہی ہیں۔ ویسے طاہرہ مظہر علی خان، ایلس فیض اور اُن کی بہن ڈاکٹر تاثیر کی بیگم، سلیمہ ہاشمی اور اُن کی بہن منیزہ ہاشمی بھی اپنے بلند مقام والد فیض کے مریدوں اور دوستوں سے اسی طرح ملتی رہی ہیں۔ سبطے صاحب کی ہمکار خاتون سعیدہ گزدر اور مرحومہ حمزہ واحد بشیر تو عالی مقام تھیں۔ فہمیدہ کے بارے میں کیا کہوں۔ شروع ہی سے انہوں نے ملک پناہ مرحوم، آزاد جمالدینی اور مجھ سے بھائیوں جیسا سلوک روا رکھا ہے۔

زندہ رہیں یہ پاکستان کی باوقار خواتین اور ان کی یہ عالمانہ اور محبت بھری روایت اور پاکستان میں روشن خیالی کا طریقہ۔ مجھے افسوس ہے، میں بھول گیا۔ ایک اور سیمینار میں جس کا اہتمام ماہنامہ **''جفاکش''** کے پادریوں اور مشہور بلوچ ادیب اور بلند مقام دانش ور رحیم بخش آزاد نے کیا تھا۔ اس میں ہماری بہن زاہدہ حنا شریک تھیں۔ وہ بھی ہم سے اسی طرح ملی تھیں۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر مبشر حسن بھی شریک تھے۔ ویسے بہن زاہدہ حنا اور پروفیسر جمال نقوی نے بہت ہی اچھا رسالہ **''روشن خیال''** کے نام سے کافی عرصہ نکالا اور روشن خیالی پھیلاتے رہے۔ نہ جانے اس کا کیا بنا؟ اب بھی شائع ہوتا ہے کہ نہیں!۔

خواتین کی اس نئی روایت کو عام کرنے میں میرِ شمعِ فروزاں جناب ڈاکٹر شاہ محمد مری نے بھی بہت جہاد کیا ہے۔ مری ہوتے ہوئے، جہاں عورت کی طرف دیکھنے ہی کو نہ جانے کس طرح دیکھا جاتا ہے، اس کافری کے بت کو توڑا ہے۔ ان کی نیک اور نہایت

مہربان بیوی نے پہلی دعوت میں ان کے دوستوں سے ہاتھ ملا کر استقبال کیا تھا۔نہایت ہی عظیم خاتون ہیں جو اس جہالت اور تاریکی کے ماحول میں اپنے شوہر کے ہم قدم ہیں اور بہادر ہیں۔خدا انہیں ہمیشہ حیات رکھے۔

سبطے صاحب کے بارے میں جب ہمیں بلایا گیا جلسہ گاہ میں،تو جاتے ہوئے پہلی مرتبہ ایک ایسی نوجوان شخصیت سے ملاقات ہوئی جسے بعد میں میں نے ہمیشہ مصروف پایا۔وہ شخصیت میرے بہت ہی عزیز دوست احمد سلیم کی تھی۔ جب انہیں دیکھا تو کتابوں کا بیگ اُٹھائے ہوئے۔احمد سلیم نے فوراً ایک دو کتابیں مجھے عنایت کیں۔اجرک کی چادر گردن پر لپیٹے ہوئے اور بغل جولا کتابوں سے بھرا ہوا۔

جب اسٹیج پر پہنچا تو میری آنکھیں حمید اختر کو ڈھونڈتی رہیں۔جن کا نام برسوں پہلے انجم قزلباش کے مبارک ہونٹوں سے سنا تھا۔پھر ہمیشہ **لٹ خانہ** میں ان کی کتابیں اور روزنامہ ''**امروز**'' لاہور میں ان کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا رہا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ حمید اختر سیمینار میں لاہور سے تشریف لا رہے ہیں۔ وہاں ایک صحت مند اور دلکش چہرے پر آنکھیں جم گئیں۔ میں حمید اختر کہہ کر ان سے ملنے کو لپکا۔تو انہوں نے جھٹ سے جواب دیا:'' حمید اختر نہیں،مبارک علی''۔ڈاکٹر مبارک علی سے تو بہت پہلے سے واقف تھا،ان کی کتابیں پڑھتا رہا تھا۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ان سے بغلگیر ہوا۔انہوں نے بہت پیار کا اظہار کیا۔خوش ہوا کہ حمید اختر کا نعم البدل کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔اور بھی کئی شخصیات سے ملاقات ہوئی۔شاید وہاں بھی سیمینار کی صدارت استادِ محترم کرار حسین کر رہے تھے۔

میں نے اپنا پیپر پڑھا۔اقبال کے **پیامِ مشرق** کی مشہور نظم سے ابتدا کی۔ میں اس روشن فکری اور آزاد خیالی کے ماحول سے بہت ہی متاثر تھا۔اور خوش تھا کہ قسمت نے ایسے عالی فکر وظرف لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔

بسے گزشت کہ آدم دریں سرائے کہن
مثالِ دانہ تھہ سنگِ آسیابود است
فریبِ زاری وافسون قیصری خورد است
اسیرِ حلقہ دامِ کلیسا بود است
غلامِ گرسنہ دیدی کہ بردرید آخر
قمیصِ خواجہ کہ رنگیں زخون مابوداست
شرارِ آتشِ جمہورو کہنہ ساماں سوخت
ردائے پیرِ کلیسا قبائے سلطاں سوخت

یہ نظم نہایت ہی جوش اور جذبہ سے پڑھی۔پیپر پڑھنے کے بعد بہت تالیاں نہایت زور سے بجیں اور پر جوش داد حاصل کی۔ یہاں گلاب جان بلوچ، رحیم بخش آزاد کے علاوہ میرے دو بڑے نام ورشاگرد فدا احمد بلوچ اور ڈاکٹر تاج گچکی بھی موجود تھے۔وہ بھی بہت خوش ہوئے۔وقفہ کے وقت مجھ سے ملے،خوشی کا اظہار کیا اور تعریف کی۔

یہ تو ہوئی اپنی تعریف جو اچھی بات نہیں۔مگر کیا کیا جائے انسانی کمزوریاں بہت ہیں۔کوشش سے بھی بہت کم لوگ اس پر قابو پاتے ہیں۔

اب دیکھئے اپنے سوا کسی اور کی تقریر اور تعریف یاد نہیں۔ بہر کیف،سامعین میں پذیرائی ہوئی اور حوصلہ ملا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ اب بھی تحریر بیماری اور معذوری کے باوجود جاری ہے۔روشن خیالی اور ترقی پسندی سے وابستگی مضبوط ہے۔

گولڈن جوبلی کانفرنس کے نتائج نہایت ہی مفید اور حوصلہ دینے والے بنے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ سبطے صاحب کی وفات کے باوجود اس کے دوست اور رفقا بددل نہ ہوئے بلکہ ان کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے مزید حوصلہ مند رہے۔

''**ارتقا**'' کا اجرا ہوا۔ جو نہایت ہی خوب صورتی اور پُر مایہ اشاعت سے روشن فکری اور ترقی پسندی کو پھیلانے میں کوشاں ہے۔

''**ارتقا**'' کے پہلے شمارے کے مشاورین میں بلوچستان سے جناب جعفر اچکزئی اور میرا نام شامل تھا۔ جو بعد میں ترک کر دیے گئے۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہوا۔ ہم نے ''**ارتقا**'' کے لیے نہ قلمی، نہ عملی، نہ مادی معاونت کی۔ مگر راحت سعید کی روشن خیالی اور ترقی پسندی سے وابستگی ''**ارتقا**'' کی ہر نئی اشاعت میں نت نئے انداز میں نمایاں ہوتی رہی۔ کیا ہی باحوصلہ اور کمیٹڈ اور پیارے انسان ہیں۔ سبطِ حسن کے بہترین جانشین۔ ان کے ساتھ بعد اور ہی باکمال دانش وراس چراغ کو روشن کرنے میں بہت ہی خوب صورت انداز میں شامل ہوئے۔ حسن عابد صاحب، حسن عابدی، میرے پیارے بھائی اور کامریڈ عزیز سلام کی یادگار واحد بشیر بیماری کے باوجود مضبوطی سے وابستہ ہیں۔ اور پھر ہمارے دور کے علامہ ترقی پسند ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور اُن کے پرانے ہمکار ڈاکٹر جعفر اب اس خوب صورت اور منور قندیل کو مزید روشن کرنے میں مگن ہیں اور ہر سمت روشنی پھیلا رہے ہیں۔ گویا ''**ارتقا**'' اسم بامسما ہے۔ خدا کرے یہ روشنی اور روشنی کا مینار ہمیشہ برقرار رہے۔

''**ارتقا**'' نے جو عملی اور ادبی کام کیے ہیں، ان کی تعریف مجھ جیسے کم فہم کیا کر سکیں گے۔ بہر کیف میری رائے ہے کہ یہ مجلّہ پاکستان میں بے مثال ہے۔ صرف ادبی خدمات کے لیے نہیں بلکہ علوم کے مختلف شعبوں کو اپنے قارئین کو پیش کر رہا ہے۔ اکادمی آف سوشل سائنسز کا کام کر رہا ہے۔ اور اس کے اکادیمیشنز ڈاکٹر محمد علی صدیقی جیسے دانش ور ہیں۔

''**ارتقا**'' کے علاوہ گولڈن جوبلی کے شریک دانش وروں نے ہر زبان کی ایسی ہی کانفرنسوں کا اہتمام کیا اور کرتے آ رہے ہیں۔ پنجابی زبان کے باحوصلہ اور ہنر مند دانش ور فخر زمان نے پنجابی کی کئی بین الاقوامی کانفرنسیں کیں اور اس میں دیگر زبانوں کے ادیبوں

اور شعرا کو دعوتیں دیں۔ اسی طرح پشتو کے نہایت ہی مستعد اور کمیٹڈ ترقی پسند ادیب مرحوم فارغ بخاری اور مرحوم رضا ہمدانی کے نوجوان ساتھی سلیم راز نے پشاور میں بہت ہی بڑی اور کامیاب بین الاقوامی کانفرنسیں کیں۔ کوئٹہ میں بھی پشتو کی اسی طرح کی کامیاب کانفرنسیں ہوئیں۔

ہمارے پیارے دوستوں نے جن میں ڈاکٹر امیر الدین پیش پیش تھے، کوئٹہ میں ایسی ایک ملٹی لنگول بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ اس آرزو میں جان تک دے دی۔

ہماری کوششوں کا نتیجہ ڈاکٹر شاہ محمد اور ان کے ماہنامہ ''**نوکیں دور**'' (نیا زمانہ) اور اس کے بعد ماہنامہ ''**سنگت**'' کی صورت میں نمودار ہوا۔ بارہ سال سے ڈاکٹر شاہ محمد اسی روشنی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ بہت ہی باکمال طریقہ سے اسے پھیلا رہے ہیں۔ ان کی اس کوشش سے ہمارے درویش صفت دوست اور دانش ور افتخار عارف نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ سبطِ حسن کے ''**لیل ونہار**'' کے بعد شاہ محمد کا ماہنامہ ''**سنگت**'' وہی کچھ کر رہا ہے اور اس مشن کو آگے بڑھا رہا ہے۔

یونہی برقرار اور روشن تر رہے یہ شمعِ فروزاں!

اور زندہ رہے ڈاکٹر شاہ محمد جو اس تاریک ماحول اور ہر طرف جہالت کے گھپ اندھیرے میں یہ شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

سندھی زبان، سندھی ادیبوں اور دانش وروں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ وہ تو اپنی زبان اور ادب کے شیدائی ہیں۔ شاہ لطیف نے ان کے لیے ایسا ہی کام کیا ہے، جس طرح مولانا جلال الدین رومی اور فارسی زبان کے دیگر عالمی اور انسانی تاریخ کے باکمال فارسی شعرا نے کیا ہے۔

کامریڈ سوبھوگیان چندانی اور محترم ابراہیم جویو نے ایک ایسی تحریک ''سندھی ادبی سنگت'' کے نام سے چلائی ہے، جو گاؤں گاؤں قریہ قریہ سندھ میں زندہ جاوداں ہے۔ اور اب اس تحریک کی صورت بین الاقوامی ہوگئی ہے۔

سدا سرخرو رہیں ترقی پسند ادیب و دانش ور اور ترقی پسند ادب کی تحریک جس کی بنیاد سجاد ظہیر، فیض صاحب، سبطِ حسن اور ان کے رفقا نے نہایت وابستگی اور لگن و دانش مندی سے رکھی تھی۔

6

شمع تو خوش قسمتی سے فروزاں رہی ہے۔ مگر بدبختی میری تھی کہ میں اس کا ساتھ نہیں دے پایا۔ قلم یک لخت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور میں نے مہینوں اس کے لیے کچھ کام نہیں کیا۔

خوش بخت وہ انسان ہیں جن کے ہاتھ میں قلم اس لیے ہے کہ وہ انسانی ترقی، امن اور محبت کے لیے لکھتے ہیں۔

بد بخت وہ انسان ہیں جو قلم بھی رکھتے ہیں، کتاب بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر انسانی ترقی، امن اور محبت سے نابلد ہیں۔ اور وہ ہمیشہ برائی کے لیے، نفرت کے لیے، دشمنی کے لیے اور اچھے لوگوں کی کردار کشی کے لیے انسانی ترقی کی اس نعمت کو بدی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں کہیں تو شیطان کہا گیا ہے، کہیں راکشس اور کہیں بدروحوں سے یاد کیا گیا ہے۔

میرا یہ سلسلہ انہی بدروحوں سے نفرت اور نیک روحوں کی ہم آہنگی و یک جہتی کے لیے شروع ہوا تھا۔

کیا لکھوں؟ کیا نہ لکھوں؟ ۔ اچھوں کی بھی اس جہاں میں کمی نہیں ۔ مگر بد بخت بدستور موجود ہیں ۔ ان سے انسانیت اب تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی ۔ مگر اچھے انسان اور روشن خیال و روشن فکر انسان دوست لوگ بھلائی کے لیے برابر عمل اور جدو جہد کرنے والے پُر امید ہیں کہ بالآخر وہی ہوگا، جو ہونا چاہیے:

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

-اقبالؔ

شروع اس سے کیا تھا کہ قلم کی حرمت کا پاس ہو۔ میرے خیال میں، میرا کیا خیال ہے، میں نے جو سیکھا ہے اس سے میرا ذہن یوں اخذ کرتا ہے کہ انسانی معاشرہ اور اس میں جو ویلیوز ہیں، وہ کنجی ہے انسانی فکر و عمل کی ۔ زندگی جسے کہتے ہیں، وہ نتیجہ ہے حیات کے ارتقا کا۔ اس میں انسان نے Myth، مذہب، زبان، تحریر، جنگ، نفرت، محبت، ہنر، ادب، تہذیب ۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا کیا سیکھا اور ان کی ترقی ہوئی ۔ میں سمجھتا ہوں زبان و تحریر سب سے بہتر ترقی ہے ۔ اگر انہیں مثبت انداز سے کام میں لایا جائے ۔ اور اگر منفی انداز میں انہیں انسان استعمال کریں تو مولانا جلال الدین رومی کا یہ شعر حقیقت ہے:

علم را بر دل زنی یارے بود

علم را بر تن زنی مارے بود

یہی تو تمام اچھے انسان، پیغمبر، فلسفی، اولیائے کرام، اوتار اور مفکرین نے بتایا ہے۔ انسانی حرص، مایہ سے محبت، شہرت طلبی، منصب پرستی نہ جانے کیا کیا انسانی غلاظتیں اس علم کو تن کے لیے استعمال کرنے سے پیدا ہوئی ہیں۔

اس کے لیے ضمیر نیازی کی ضمیر پرستی کی تخلیق **''زمین کا نوحہ''** کو ہر انسان اور نوآموز انسان کو پڑھنا چاہیے ۔ یا پھر حرمت قلم کی پذیرائی ان انسانوں نے کی جنہوں نے کراچی میں چند سال پہلے اسی ضمیر نیازی کی پیروی کر کے قلم برائے امن کے نام سے کانفرنس کی تھی۔ جس میں ملک کے بڑے بڑے نام ور دانش وروں اور انسان دوستوں نے شرکت کی۔ حرمتِ قلم و دانش کی خدمت کی ۔ امن و محبت کی تلقین کی اور علم و دانش کا حق ادا کیا۔ مگر پھر بھی، ؎ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

میری بدبختی کہ اس عظیم انسان دوستی کے اجتماع میں شریک نہیں ہو سکا۔ مگر میرے باوقار قابل احترام رفیقوں، سنگتوں نے اس میں بھرپور شرکت کی اور مقالے پڑھے ۔ بلوچستان کی ایک مرتبہ پھر خوب نمائندگی ہوئی ۔ میرے محترم دوست اور مرحوم دانش ور ڈاکٹر سید امیر الدین نے کراچی سے واپس آ کر بہت پر جوش انداز میں کانفرنس کی روداد سے مجھے آگاہ کیا۔ اور اس پر فخر کیا کہ سب سے بہترین مقالہ اور باتیں ہمارے شمع فروزاں، شاہ محمد مری کی تھیں۔

اس میں ہمارے شیام کمار، سرور جان اور خود امیر الدین نے شرکت کی اور اس کے عظیم دوست اور احباب اہلِ 'ارتقا' نے اس تاریخ ساز کانفرنس کو منظّم کیا تھا۔

سید امیر الدین نے مجھے ضمیر نیازی کی عظمت سے آگاہ کیا۔ اور ان کی جانب سے **''زمین کا نوحہ''** کی ایک جلد پیش کی۔ اور بتایا کہ اس میں بھی بلوچستان کی نمائندگی ہے۔ وہ اس طرح کہ بلوچستان کے بلوچی زبان کے عظیم شاعر گل خان نصیر کی عظیم بیٹی گوہر ملک کا مشہور افسانہ ''اور بلوچ نے مجھے دکھا دیا'' (ان کے بلوچی افسانہ کا اردو ترجمہ جسے نوخیز ادیب مجید زہیر نے اردو میں ترجمہ کیا ہے) شامل ہے۔ جس سے میرا سر اونچا ہوا اور دل باغ باغ ہوا۔

یہ ہے حرمتِ قلم اور انسان دوستی کا قصہ۔ کراچی سے کئی یادیں وابستہ ہیں ۔ سچ

پوچھئے کہ کراچی ہی میں اچھے انسانوں کی محبت ، رفاقت اور علم ودانش نے میرے ذہن کو پرورش دی ہے اور جو کچھ کالج ، اور بعدازاں ملازمت کے دوران زندگی کے واقعات اور معاشرے کے حقائق نے اور پھر ملازمت سے علیحدگی اختیار کر کے **لٹ خانہ** میں ساتھیوں کی محبت اور پھر انجم قزلباش، سید کامل القادری، کمال خان، بہادر خان، اور ڈاکٹر خدائیداد کی سنگتی میں جو کچھ پڑھا اور نظریاتی علم حاصل کیا، سوشلزم اور اس کے پرچار سے وابستگی سے جو دانش حاصل کی۔ کراچی میں اور اس میں جو سیاسی، اقتصادی، سماجی روئیدگی تھی، اسے بہ چشم خود دیکھ کر آہستہ آہستہ فکری پختگی حاصل ہوئی۔ پھر سوبھو گیان چندانی، قادر بخش نظامانی، پوہو مل، مزدوروں اور کسانوں کے عظیم لیڈر سید حسن ناصر اور بعد میں کسان تحریک کے کمیٹڈ زعما حیدر بخش جتوئی، میر علی محمد تالپور، غلام محمد لغاری نے ذہن کو پختگی کی طرف بڑھایا۔ پھر اس وقت کراچی ہی میں کارخانوں کے مزدوروں اور صنعتی ترقی نے سوشلزم سے مزید وابستگی بخشی۔

رات کو 'لی مارکیٹ' میں ماہنامہ ''**بلوچی**'' کے دفتر میں گرمی سے پریشان ہو کر سمندر کی ہوا حاصل کرنے کے لیے ککری گراؤنڈ اور مٹھادر کی جانب سڑک پہ نکلتا تو وہاں فٹ پاتھ پر ان مزدوروں کو قمیص نکال کر (اگر قمیص نام کی چیز اُن کے پاس ہوتی) لیٹے ہوئے پاتا، تو اینگلز کی کتاب ''مزدور طبقہ کی حالت انگلستان میں'' کی سچائی اور حقیقت معلوم ہوتی۔ جو مزدور انہوں نے بیان کیے تھے ان کا تعلق بیشتر آئرلینڈ، سکاٹ لینڈ اور ویلز سے تھا، جو بھوک کی شدت اور معاشرہ میں تبدیلی کے سبب روزگار کی تلاش میں صنعتی شہروں کی جانب لندن، لیورپول، شفیلڈ اور ٹیکسٹائل کی صنعت کے مشہور شہروں کی جانب پیدل چل کر آتے۔ انہیں ''جرنی مین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

یہاں یہ مزدور بیشتر سواتی اور کوہستانی تھے۔ وہ بھی بہ صد دِقت کراچی پہنچتے۔ گھی، ٹیکسٹائل، تیل ملوں اور منگو پیر کے صنعتی علاقہ میں روزگار حاصل کرنے کے لیے آتے۔ بعد میں ان کی مشہور بستیاں پٹھان کالونی، فرنٹیئر کالونی، بنارس، پاک کالونی نہ جانے مزدوروں

کی کتنی بستیاں آباد ہوئیں۔ اس طرح مزدور طبقہ، ان کی ناگفتہ بہ زندگی اور مسائل سے آگاہی ہوئی۔

پھر **بلوچی** ماہنامہ میں بھائی کی شرکت سے بلوچ دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں سے تعلق پیدا ہوا۔ بلوچی ادب کی خدمت کا موقع ملا۔ اور پھر مرحوم قادر بخش کی راہنمائی اور محبت سے بہت کچھ حاصل کیا۔ انہی کی وجہ سے سوویت یونین کے انفارمیشن سینٹر میں ملازمت حاصل کی۔

قادر بخش صاحب کہتے تھے کہ یہ ادارہ اور اس سے تعلق خود ایک علمی درس گاہ اور یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوویت یونین دیکھے بغیر سوویت یونین دیکھ سکو گے۔ لینن کے نظام کا نظارہ کر سکو گے اور انسان بننے کے قابل ہو سکو گے۔

نظامانی نے سچ کہا تھا۔ '**طلوع**' سے وابستگی نے میری اس تعلیم کو تکمیل دی۔ اس کے لیے میں قادر بخش نظامانی کو اپنا محسن مانتا ہوں اور ان کے اس احسان کا شکر گزار ہوں۔ میری طرح اور لوگوں کو بھی انہوں نے ایسا ہی قابل بنایا۔

اگر کراچی کے ان واقعات، ایام اور زندگی کا یہ حصہ جو میں نے وہاں گزارا، اس پر کتاب لکھوں تو یہ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مگر میں اب اس قابل نہیں رہا کہ یہ خدمت سرانجام دے سکوں۔ اس کا ملال اور افسوس ہے۔

کراچی میں زندگی کے بہترین ایام گزارنے کا بیان کرتے ہوئے اگر انیس بھائی اور ان کے ''سوشلسٹ فورم'' کا ذکر نہ ہو تو یہ تحریر میرے حساب سے نامکمل ہے۔

یہ نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کا دور تھا اور این ایس ایف (نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن) کا۔ صدر ایوب کے مارشل لا اور امریکہ کی دوستی نے پاکستان میں ترقی کی وہ تمام راہیں مسدود کر دیں جن سے گزر کر عوام اچھی زندگی کے لیے جدوجہد کر کے ترقی کرتے اور زندگی کے مسائل حل کیے جاتے۔ ترقی پسند رہنما، دانش ور اور انسان دوست پسِ زنداں

چلے گئے تھے۔ مزدوروں اور ترقی پسندوں کے سب سے محبوب ومقبول لیڈر حسن ناصر رسوائے عالم اذیت گاہ شاہی قلعہ میں شہید کر دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود زندگی کی جدوجہد رک نہ سکی۔ جیسے کہ اقبال نے درست کہا ہے:

مازندہ ازان ایم کہ آرام نگیریم

(ترجمہ: ہم اس لیے زندہ ہیں کہ چین سے نہیں بیٹھتے)

نیپ کے زمانہ میں دستور تھا کہ مزدور پارٹی کا جنرل سیکرٹری ہی کراچی شہر کے نیپ کا سیکرٹری ہوا کرتا تھا۔ حسن ناصر مرحوم نیپ کے قیام کے بعد کراچی نیپ کے سیکرٹری تھے۔ اس وقت میں یہی جانتا تھا کیوں کہ کراچی پہنچتے ہی ہم ترقی پسند حسن ناصر کے دفتر جو، ان کا ٹھکانہ بھی تھا، پہنچ جاتے۔

ایک مرتبہ میں اور انجم قزلباش کوئٹہ سے آکر سیدھا ان کے دفتر پہنچے۔ جو بندر روڈ کی پچھلی گلی میں تھا۔ ان کے ساتھ ان کا باوفا ساتھی جو صوبہ سرحد کا پٹھان مزدور تھا اور اس کا نام مجھے اب یاد نہیں۔ ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں زیادہ دیر تک بیٹھنے نہیں دے رہے تھے اور کہا کہ جلدی سے منگو پیر روڈ بسم اللہ ہوٹل چلے جاؤ، وہاں مزدوروں کی میٹنگ ہے، اس میں شامل ہو جاؤ۔ اس وقت میٹنگیں احاطوں میں ہوا کرتی تھیں۔ باہر ان کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ میں اور انجم نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد میں جب بھی کراچی میں موجود ہوتا، اکثر حسن ناصر سے ملنے ان کے دفتر اور ان کی اسی رہائش گاہ جاتا۔ جب تک وہ شاہی قلعہ پہنچائے نہیں گئے تھے اور انڈر گراؤنڈ تھے۔ مارشل لا نہیں لگا تھا اور میں وہیں کراچی میں بھائی کے پاس تھا اور **"سوویت خبریں"** کی پندرہ روزہ اشاعت کا پروف ریڈر تھا۔ تو شام اور رات کو اکثر سوبھو کے یہاں بندر روڈ پر آشرم میں جہاں سوبھو اور ان کی فیملی رہتی تھی، وہاں جایا کرتا۔ وہاں سوبھو، ناصر،

شرف علی اور پوہو سے ملاقات ہوتی اور ان سے انسانیت کی تعلیم حاصل کرتا رہتا۔ بعد میں جب ہم نیپ والے کراچی آئے یا کوئٹہ سے شہر بدر کر کے کراچی میں ہوتے تو پارٹی سیکرٹری (اس کے بارے میں نہیں جانتا) کراچی شہر کے سیکرٹری انیس بھائی تھے۔ (یقیناً پارٹی کے بھی سیکرٹری ہوں گے)، نیپ کے حوالے سے تھے۔ گل خان نصیر اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ملاقات ہوتی۔ ان کے ساتھ نواز بٹ، ایک نقوی صاحب تھے، اور چند دوسروں کے ہم راہ ملاقات ہوئی۔ اس سے زیادہ انیس بھائی سے وابستگی نہ تھی۔

انیس ہاشمی سے دوستی طلوع کے دفتر میں ہمارے ہم کار اور نہایت ہی پیارے اور سرگرم ساتھی مسرت کی وجہ سے ہوئی۔ وہ روز آ کر مجھے اور بھائی احمد باشام (طلوع کے آرٹسٹ) کو انیس صاحب کے بارے میں بتاتے۔ اسی طرح میں مسرت بھائی کا مشکور ہوں کہ انیس صاحب سے واقفیت کرا دی۔

اس زمانے میں انیس صاحب روزنامہ جنگ میں کالم نگار تھے۔ اور اکثر وہ اقتصادیات کے حوالے سے اپنے خیالات کی اشاعت کرتے۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا کاروبار کرتے۔ تولیہ وغیرہ بنوا کر سوویت یونین ایکسپورٹ کرتے (مسرت نے یہ بتایا تھا)۔ میرے لیے سب سے اہم بات جس کی وجہ سے مجھے انیس بھائی سے محبت ہوئی وہ ان کے "سوشلسٹ فورم" کی تنظیم کاری تھی۔

ناظم آباد پہلی چورنگی کے پاس چورنگی کی جانب جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کے اوپر کی منزل پر ایک بہت بڑا نمایاں بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر انگریزی میں "سوشلسٹ فورم" لکھا ہوا تھا۔ میں جب بھی کام سے واپس نارتھ ناظم آباد گھر جاتا تو نظریں اس بورڈ تک جاتیں اور صبح جب میں **طلوع** کی ویگن میں دفتر جاتا اور ویگن مجھے نارتھ ناظم آباد سے لے کر اس چورنگی پہنچتی تو احمد باشام (**طلوع** کے آرٹسٹ) اس چورنگی کے پاس آفس کے لیے منتظر رہتے۔ وہاں سے ہم مل کر دفتر پہنچتے۔

سوشلسٹ فورم رضویہ کالونی کے شروع میں تھا۔ اور احمد باشام کے گھر وہیں سے راستہ جاتا۔ فورم کا بس ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرے سے ملحق ایک بڑا احاطہ تھا۔ کمرے میں ایک نوجوان کامریڈ مہری (نام ٹھیک طرح یاد نہیں) خوب صورت اور بھورے رنگ کے بالوں اور چہرے سے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اکثر **طلوع** کے دفتر باشام کے پاس آتے۔ اس طرح ان سے شناسائی اور دوستی ہوئی۔ میں کبھی کبھی بس سے اتر کر ان سے ملنے فورم کے دفتر جاتا۔ اور اس طرح گپ شپ ہوتی۔ اسی طرح بلوچستان کے دیگر نوجوان بھی ان سے ملنے فورم کے دفتر جاتے۔ بیزن بزنجو اکثر ان کے پاس جایا کرتے۔ فورم میں شام کے وقت اکثر علمی تقاریب ہوتیں۔ اور میں ان میں شمولیت کے لیے گاہے بہ گاہے جاتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم فیض صاحب کے منتظر تھے کہ وہ احاطہ میں اوپر کی منزل چڑھ کر آئیں۔ مگر ان سے پہلے محترمہ عالیہ امام آئیں۔ فیض صاحب ان کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ فیض صاحب نے تقریر کی۔ یقیناً سوشلزم اور سوویت نظام کے بارے میں تقریر تھی۔ اس طرح اکثر سماجی مسائل پر تقریریں ہوتیں۔

بعد میں، میں مسرت کے ساتھ انیس بھائی کے گھر گیا، جو رضویہ کالونی کے سامنے فردوس کالونی میں تھا۔ گھر فورم کے دفتر کے مقابل قریب ہی تھا۔ انیس بھائی بہت پیار اور محبت سے ملے۔ ان سے باتیں ہوئیں۔

اس کے بعد انیس بھائی نے اپنی بیٹی کی شادی پر مسرت کو میرے لیے کارڈ بھجوا کر بلوایا تھا۔ شادی کی دعوت نہایت سادہ تھی۔ اس میں کئی احباب اور ہم فکر دوستوں کے علاوہ نمایاں شخصیات میجر عطا اور سید سبطِ حسن صاحب تھے۔ ان کے ساتھ ہی انیس بھائی موجود تھے۔ انیس قدآور اور سبطِ حسن چھوٹے قد کے تھے اور میجر عطا درمیانہ قد کے۔ تینوں نے سفید قمیص شلوار زیب تن کی ہوئی تھی۔

میرے خیال میں یہ سعید کی شادی تھی۔ بعد میں سعید، ان کی بیوی اور بچوں کو اسلم

اظہر صاحب کے ڈرامہ 'گلیلیو گیلی' میں دیکھا۔ پوری فیملی نے اس ڈرامے سے جو گولڈن جوبلی کی انعقاد کے وقت ریو سینما، صدر، کراچی میں ہوا تھا، حصہ لیا تھا۔ اس کے بعد جب سعید ان کی فیملی اور انیس بھائی کی بہن جو دہلی سے کوئٹہ آئے تھے، شاید یا سید امیر الدین کے یہاں ٹھہرے تھے، ہمارے گھر ملنے تشریف لائے تھے۔

چند سال بعد ایک روز انیس بھائی کو ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب بلوچستان یونیورسٹی جہاں میں بلوچی پڑھایا کرتا تھا، میرے گھر D.11 لے آئے۔ وہی لمبا قد، سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس عظیم انسان گھر آئے۔ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر چلے گئے۔

انیس بھائی کے بیک گراؤنڈ اور عظمت سے میں زیادہ واقف نہیں تھا۔ ایک مرتبہ سوبھو صاحب پر شاہ محمد کا کتابچہ ''**موہن جودڑو کا جوگی**'' شاہ محمد گھر لے آئے۔ اسے شاہ محمد نے عظیم کمیونسٹ انیس ہاشمی کے نام سے منسوب کیا تھا۔ میں اس لفظ 'عظیم کمیونسٹ' پر کچھ خوش نہیں ہوا۔ اور شاہ محمد سے اختلاف کرنے لگا۔ میرے ذہن میں حسن ناصر کی شہادت تھی لیکن اب شاہ محمد سے انیس ہاشمی کی سوشلزم سے خاندانی وابستگی اور کمٹمنٹ کے بارے میں بہت معلومات ہوئیں۔ ان کے بھتیجے کی اس کاز میں شہادت کا پتہ چلا۔ انیس بھائی اور ان کے خاندان کی عوام اور انسانوں سے وابستگی، خدمات اور وفاداری کے بارے میں سن کر حیرت ہوئی اور ابھی تک یہ کیفیت برقرار رہے۔ میں اپنی اس کور ذہنی پر افسوس کے سوا اب کیا کر سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ شاہ محمد کا احسان مند ہوں کہ وہ ہمیشہ ایسے اچھے انسانوں سے ملواتے رہتے ہیں۔ پہلے یہ کام سید امیر الدین کرتے تھے۔ اب شاہ محمد اس نیکی کے لیے رہ گئے ہیں۔ خدا انہیں زندہ پائندہ رکھے۔ انیس بھائی ہمیں چھوڑ کر اور عظیم انسانوں کی طرح اپنی عظمتیں چھوڑ کر چلے گئے۔ قسمت ہمیں ان کی پیروں کی توفیق عنایت کرے۔

7

محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت قائم ہوچکی تھی، جنرل ضیا الحق کی موت کے بعد۔ ملک میں پُر امید جمہوریت کا دور آچکا تھا۔ ہر طرف پُر امیدی کی سانسیں، لوگ لے رہے تھے۔ خصوصاً ترقی پسند قوتیں زیادہ پر امید تھیں۔ پیپلز پارٹی کے ادبی ونگ کی لگام ہمارے ترقی پسند دانش وروں کے ایک نیک اور پر عزم ساتھی فخر زمان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ پیپلز پارٹی نے ترقی پسندوں پر مکمل بھروسہ کیا تھا۔ مگر فیوڈل ازم کو کوئی دھچکا نہیں لگایا تھا۔ بہر کیف فخر زمان نے جو کراچی میں گولڈن جوبلی کے ہمارے ساتھی تھے، مرحوم سبطِ حسن کی روایت کو برقرار رکھنا چاہا۔ لاہور میں ترقی پسند دانش وروں کی کانفرنس بلائی۔ مگر اب کے اس کا نام جمہوریت پسند مصنفین کی کانفرنس رکھنا پسند کیا۔ نہ جانے کیوں؟!

بہر کیف ہمیں آم کھانے سے غرض تھی۔ ملک بھر سے دانش وروں کو لاہور بلایا گیا۔ ہمارے کوئٹہ کے ترقی پسند ساتھیوں کو بھی دعوت ملی اور بھرپور دعوت ملی۔ اور کہا جتنے

دوست شرکت کریں، کوئی پابندی نہیں۔ ہمارے ساتھیوں کی میٹنگ ہوئی اور اس میں شرکت کے لیے فیصلہ ہوا۔ صدر حسبِ دستور جعفر خان اچکزئی تھے۔ سیکرٹری جناب شیام کمار۔ میٹنگ میں مرحوم ڈاکٹر سید امیر لدین، بہادر خان رودینی، پروفیسر مرحوم مجتبیٰ حسین، مرحوم ڈاکٹر خدائیداد، پروفیسر برکت علی، صبا دشتیاری، سلطان نعیم قیصرانڑیں، کئی نامی گرامی دانش وروں اور شاعروں اور ادبا نے مختلف زبانوں (بلوچستان کی زبانوں) کی نمائندگی کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ اُس وقت تک جناب ڈاکٹر شاہ محمد مری اس انجمن میں شریک نہ تھے۔ نہ جانے کوئٹہ میں موجود تھے یا نہیں۔ مگر اس کانفرنس میں ان کی شرکت یاد نہیں۔ جناب امیر الدین صاحب اور بہادر خان بھی لاہور نہ جاسکے۔ کیوں کہ انہیں اسلام آباد ایجوکیشن منسٹر نے جو کہ ایک خاتون تھیں، ایک اہم تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر بلایا تھا۔ اور انہوں نے بتایا کہ وہاں سے فارغ ہوتے ہی وہ لاہور پہنچ جائیں گے۔

ریل سے جانے کا پراگرام بنا۔ کیوں کہ جانا ہمارے ذمہ تھا، دیگر طعام وقیام کا بندوبست بلانے والوں کے ذمہ۔ ہمارے صدر جعفر اچکزئی خزانچی تھے۔ سیکرٹری شیام کمار صاحب کی شرکت لاہور میں مجھے یاد نہیں۔ شاید نہ جاسکے۔ ڈاکٹر خدائیداد صاحب چوں کہ ریلوے مزدوروں کے محبوب رہنما تھے بلوچستان میں۔ (مگر شاہ محمد مری کہتے ہیں کہ ریلوے مزدوروں کے شعور اور تنظیم کاری کی حالت اب یہ ہوگئی ہے کہ اس محبوب اور مخلص راہنما کی موت کے وقت جنازہ میں ریلوے کے مزدوروں کی نمائندگی بالکل نہ تھی)۔

بہر کیف ریلوے کے ڈبے یا بوگی کا انتظام ڈاکٹر خدائیداد صاحب اور ان کے مزدور ساتھیوں کے ذمہ تھا۔ یہ کام انہوں نے بخوبی سرانجام دیا اور ہم سب پروفیسر مجتبیٰ حسین کی سرکردگی میں بے حد خوشی اور جوش، جذبہ کے ساتھ لاہور روانہ ہوئے۔

دو دن بعد دوپہر کے وقت لاہور کے خوب صورت ریلوے سٹیشن پر ہم سب اترے۔ کالج کے زمانے میں پشاور آمد ورفت کے دوران لاہور ریلوے سٹیشن پر (بلکہ اس

زمانے کے تمام ریلوے سٹیشنوں پر) ویلر کے بک اسٹال میری دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔ کتابیں اور رسائل۔ مجھے وہ دن یاد آئے۔

اسٹیشن پر محترمہ نائلہ قادری نے اپنے باوقار شوہر جناب مصطفیٰ رئیسانڑیں کے ہمراہ اور جمہوریت پسند مصنفین کی کانفرنس کے نمائندوں نے ہمارے بلوچستان کے وفد کی پذیرائی کی اور استقبال کیا۔ ہمیں لاہور اسٹیشن کے قریب ایک بہت بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ بلوچستان سے آئے ہوئے ساتھی بہت بڑی تعداد میں تھے۔ مجتبیٰ حسین کے ہونہار شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ افضل مراد، وحید زہیر، ڈاکٹر تاج رئیسانڑیں، عرفان بیگ، بیرم غوری، شاید محسن شکیل، خادم لہڑی، اور کئی اور۔ ہوٹل میں پروفیسر نادر قمبرانڑیں بھی موجود تھے۔ نام ور اور بہت ہی بڑے آئیڈولاگ (مارکسی) جناب عبدالحق بابئ عرف چاچا جو جوانی میں ہی سب کے چچا بنے۔ نہ صرف بزرگوں اور مزدوروں کے بلکہ آج کل تو سرداروں کے بھی چچا بن گئے ہیں اور کئی حضرات اب یاد نہیں۔

وہاں ہوٹل میں کمروں میں رہنے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ میں اور ڈاکٹر خدائیداد پروفیسر مجتبیٰ صاحب کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے ہونہار شاگردوں کا پلہ بھاری ہوا۔ مجتبیٰ صاحب کو ہم سے چھین کر لے گئے۔ مگر اچھا یہ ہوا کہ ان کا کمرہ قریب ہی تھا۔ دن رات ساتھ رہتے۔

باقی بلوچستانی ساتھی برکت علی، دشتیاری اور نعیم کیسرانڑیں بھی قریب ہی تھے۔ چاچا تو ہمیشہ جعفر اچکزئی کے ساتھ چمٹے رہتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ کانفرنس توسبطِ صاحب کی کانفرنس، دانش وروں کی ذاتی جدوجہد سے کراچی میں گولڈن جوبلی کانفرنس سے زیادہ اہم نظر آئی۔ گو کہ سرکاری کانفرنس تھی۔ اس لیے کہ اس میں کمیونسٹ پارٹی کے اس وقت کے ہمارے (میں بھی پارٹی میں شامل تھا) جناب پروفیسر جمال نقوی، محترم میر صاحب (میرے نہایت ہی مہربان دوست ساتھی ہونے کے علاوہ)' ڈاکٹر اعزاز نظیر صاحب بھی موجود تھے۔

بس ایک جام ساقی کی کمی تھی۔ امام علی نازش مرحوم (ان پر قدرت کی رحمت ہو) شاید ملک سے باہر تھے۔ تبھی تو پروفیسر جمال نقوی صاحب ان کے جاں نشین تھے۔ اب تو اپنے حوصلے بے حد بلند ہوئے اور سوشلزم کی قربت سامنے نظر آنے لگی۔

کانفرنس کی افتتاحی تقریب یاد نہیں۔ اس قدر یاد ہے کہ یہ کانفرنس لاہور کی موجودہ دور کی مشہور ترین تعمیر، واپڈا ہاؤس میں ہوئی۔ اختتام کس طرح ہوا، بالکل یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ گولڈن جوبلی کے نام ور دانش وروں اور انتظام کاروں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ نہ جناب مسلم شمیم، نہ مظہر جمیل، نہ حسن عابدی، نہ راحت سعید، نہ واحد بشیر، نہ محمد علی صدیقی۔۔۔۔ کس کس کو یاد کروں۔ یہاں تک کہ شوکت صدیقی بھی نظر نہیں آئے۔ البتہ سوبھوگیان چندانی موجود تھے۔ پروفیسر ممتاز حسین صاحب۔ کرار صاحب نہیں تھے۔ البتہ اس کانفرنس میں میری خوش قسمتی کہ 1950 سے جو نام سنتا آیا تھا، اس نام کی شخصیت سے پہلی مرتبہ آشنائی ہوئی۔ وہ شخصیت جناب سی آر اسلم کی تھی۔ صرف ان سے شناسائی نہ ہوئی بلکہ فخر زمان صاحب کی مہربانی سے جس سیشن کی پریزیڈم تھی، اس میں سی۔ آر۔ اسلم صاحب، پروفیسر مجتبیٰ ممتاز حسین صاحب، محترمہ ہاجرہ مسرور اور میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے جب اپنا پیپر، جو بہت ہی مختصر تھا۔ میں لکھتا تو کیا لکھتا، ایسے بڑے دانش وروں کی کانفرنس کے لیے۔ البتہ مجھے اس قدر یاد ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ پنجاب کے لوگوں کا رویہ ہندوستان (بھارت) کے بارے میں بدلنا چاہیے۔ گویا میرا مطلب یہاں بھی سیکولر سوچ کو پھیلایا جائے اور یہ کام دانش وراور ادیبوں کا ہے۔ میرے اس خیال کو کوئی ریسپانس نہیں ملا۔ مجھے حیرانی ہوئی۔

پھر کانفرنس میں محترم حسین نقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام بھی عرصہ سے سنتا آیا تھا۔ وہ ان دنوں ''سجن'' کے نام سے ایک پنجابی روزنامہ نکالا کرتے تھے۔ کانفرنس میں سجن تقسیم کیا گیا۔ میں نے لوگوں (دانش وروں) سے اس کار خیر کی تعریف کی۔ میرے

ایک بہت ہی پیارے دوست پروفیسر ذوالفقار قزلباش نے مجھے راز دارانہ طور پر کہا کہ یہ بات آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں تو یہاں کے دانش ور مار ڈالیں گے۔ مجھے بے حد حیرانی ہوئی۔

اس بات پر بھی حیران ہوا کہ ظہیر کاشمیری صاحب جو گولڈن جوبلی کانفرنس کراچی میں روح رواں میں سے تھے، نظر نہیں آئے۔ نہ طاہرہ مظہر علی خان آئی تھیں۔ نہ احمد ندیم قاسمی صاحب جو اسلام آباد میں ضیا الحق صاحب کے مارشل لا کے دوران قلم کاروں کے اس اجتماع میں موجود تھے جس میں ضیا الحق صاحب نے ادیبوں کو گالیاں دیں۔ میں اور مجتبیٰ صاحب موجود تھے۔ ہم شرم کے مارے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ اور پھر ساتھ ہی احمد ندیم قاسمی کھڑے تھے، چہرے پر غصہ لئے ہوئے۔ مگر خاموش، مجھے اس وقت فارسی کا یہ شعر یاد آیا:

؎ چشم بہ روئے او کشا باز بہ خویشتن نگر

لاہور کے نامی گرامی ادیبوں میں کسی ایک کو نہیں دیکھا۔ ظہیر کاشمیری، حبیب جالب، ملک برادران (رؤف ملک اور عبداللہ ملک)، حمید اختر، صفدر میر (زینو) جنہیں میں جانتا تھا۔ ایک بھی نظر نہیں آئے۔

کراچی سے زاہدہ حنا تشریف لائی تھیں۔ زاہدہ، کشور ناہید اور بیگم فخر زمان ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ مدیحہ گوہر اور فریال گوہر کی والدہ سے (میں نے انہیں اگر چہ نہیں دیکھا تھا) انہوں نے مہربانی کر کے خود اپنا تعارف کرایا۔ وہیں کانفرنس میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے ہندوستان سے شاید حیدر آباد، یا جنوبی ہند سے بہت سخت مصیبتیں جھیل کر اونٹوں اور پیدل ریگستانوں سے ہوتے ہوئے ہجرت کی تھی اور پاکستان پہنچی تھیں۔ ماشا اللہ کیا قابل اور ہنر مند اور بلند مقام بیٹیاں پالتی رہی ہیں۔ ایسی مائیں قابلِ صد احترام ہیں۔

کانفرنس میں بہت ہی قابل اور عالم حضرات نے اپنے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن، ڈاکٹر پرویز مہدی، کئی اور نام یاد نہیں۔ مگر ہال میں سب سے زیادہ چرچا پروفیسر افضل توصیف اور پروفیسر رضی صاحب کا سنا۔ افضل توصیف سے بس اب تو زندگی بھر کا تعلق ہوا۔ وہ جب بھی کوئٹہ اور بلوچستان آئیں، ہم غریبوں سے ملنے آتی رہیں۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی ملنے تشریف لائیں اور دیر تک ان سے باتیں ہوتیں رہیں۔ دو کتابیں عنایت کیں۔ نادر صاحب اور پروفیسر بہادر خان سے بھی وہیں آشنائی ہوئی۔ پھر میرے گھر (بیماری کے دوران) آئیں؛ سسٹر ثبینہ رفعت اور شاہ محمد مری کے ہمراہ۔ پروفیسر عبدالرحمٰن پہوال سے میرے گھر میں ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے لیے افغانستان سے ڈاکٹر شاہ محمد کے پاس آئے تھے۔ بہت محبت اور پیار اور انسان دوستی، علم دوستی کی باتیں ہوئیں۔

افضل توصیف کو تو کوئٹہ اور بلوچستان سے عشق ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ اپنے اس لگاؤ کا اظہار کرتی ہیں۔ خود بھی تو بہت ہی اونچی فکر کی خاتون ہیں۔ قدرت نے دریا جیسا دل انہیں بخشا ہے۔ ثبینہ کے ساتھ ان کا ملاپ قابل رشک تھا۔

کانفرنس کے تین دن زندگی کے بہت ہی پُر لطف دن تھے۔ ہر طرف دلبرانِ لاہور کی محبت اور سخاوت اور انسان دوستی جھلک رہی تھی۔ واقعی بقول ندیم صاحب لاہور، لاہور ہے۔ کاش کہ سید امیر الدین، پروفیسر بہادر خان، شیام کمار اور ڈاکٹر شاہ محمد مری بھی اس کانفرنس میں شریک ہوتے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ بہت ہی خوش و خرم وقت گزار رہے تھے۔ انہیں مختلف ادیبوں، دانش وروں اور فارغ وقت میں ادبی اداروں میں لے جاتے اور ملواتے۔ اس کے علاوہ ان کی دوستی ایک نہایت ہی مفلوج مگر بہت ہی ذہین اور پیارے انسان ڈاکٹر طارق عزیز سے تھی۔ جو رات کو ہوٹل آتے اور ان سے اور ان کے ہونہار شاگردوں سے ملاقات کرتے۔ کسے خبر تھی کہ ایک دو روز کے بعد مجتبیٰ صاحب سب کو چھوڑ کر

ہمیشہ کے لیے جدا ہوں گے۔ انہی ڈاکٹر طارق عزیز کی کار میں کراچی کے لیے ائیر پورٹ پر جاتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ اور انہوں نے جان دے دی۔

مجتبیٰ حسین کی جدائی ہم سب کے لیے ،بلوچستان کے دانش وروں اور استادوں کے لیے، بلوچستان یونیورسٹی کے لیے ایک نہایت ہی بڑا نقصان ثابت ہوا۔ وہ گوہرِ بے مثل سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس طرح لاہور میں فخر زمان کی محبت بھری جمہوریت پسند ادیبوں کی کانفرنس ہمارے لیے المیہ کی صورت میں اختتام پذیر ہوئی۔ اس طرح جس گولڈن جوبلی کے بعد لکھنؤ میں عظیم انسان اور دانشور سبطِ حسن کی موت سے علمی حلقوں، ادیبوں، دانش وروں کو بہت بڑا نقصان ہوا۔

لاہور کے بارے میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اور تعلیم اور علم سے وابستگی شروع ہوئی تھی، لاہور سے آگاہی ہوئی تھی۔ لاہور جو علم، کالجوں اور علمی کتابوں کا شہر رہا ہے، اس کی کیا تعریف کروں۔ لاہور کے نام سے اقبال، فیض اور کئی عظیم ہستیوں کے ناموں سے وابستگی ہے۔ مولانا کامریڈ عبدالباری، فیروز الدین منصور، مرزا ابراہیم، پھر فیض صاحب کے ساتھ بنے بھائی کی محبت اور ظلم ستم کا ایک ساتھ سہنا۔ سبطِ حسن، حسن عابدی، افضل، فضل الٰہی قربان؛ کس کس کو یاد کیجیے، کس کس کو روئیے!!

لاہور جو ترقی پسندوں کا مرکز بنا۔ جس نے ترقی پسندی کو اس حصہ برصغیر جسے اب پاکستان کہا جاتا ہے، میرے لیے کرۂ زمین تمام ایک ہے۔ اور اس میں بسنے والے مظلوم انسان جو استحصال کی چکی میں پس رہے ہیں، اور جو زندہ رہنا چاہتے ہیں، سب کا المیہ اور مقصد حیات ایک ہے۔ سب برابر ہیں۔

میاں افتخار الدین، پروگریسو پیپرز، امروز، لیل ونہار، ایوب احمد کرمانی، پھر بڑی خوش قسمتی ہوئی کہ سی آر اسلم کو صحت منداور زندہ دیکھا۔

لاہور علم ودانش کا مرکز ہے۔ اس سے خوش قسمت ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس شہر سے دو تحفے نہایت ہی قیمتی اور ثمر بار ملے ہیں۔ کوئٹہ اور بلوچستان کو۔ سب سے پہلا تحفہ جناب انجم قزلباش کی صورت میں۔ جو مذکورہ بالا شخصیات سے فیض حاصل کر کے آئے اور **لٹ خانہ** میں رہے۔ انہوں نے بلوچستان میں روشن خیالی، خرد دوستی اور ترقی پسندی کی بنیاد فراہم کی۔ سیاست میں، صحافت میں اور بالخصوص ادب، نثر، نظم (شاعری) میں۔ آزاد جمالدینی انہی کی فکر کی پیداوار تھے اور ان سے فیض حاصل کر کے ان کی سوچ وفکر یکسر بدل گئی اور مظلوم عوام کے لیے شاعری کرتے رہے۔ ادب کو پروان چڑھاتے رہے۔ ان کے ہمراہ سید کامل القادری نے بھی پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے کتابیں لا کر ڈھیر کیں۔ ان کی کوششوں سے ترقی پسند کتابیں کوئٹہ میں آنے لگیں۔ لٹ خانہ اور فی الحال سٹیشنری مارٹ انہی کے فیض سے کتابوں کے خزانے ہوئے، جن سے کالج کے طلبا استفادہ کرتے رہے۔

دوسرا تحفہ ڈاکٹر شاہ محمد کی صورت میں کوئٹہ اور بلوچستان اور آج کل ان کی محنتوں سے تمام پاکستان ماہنامہ ''**سنگت**'' کی صورت میں ذہنی طور پر آگاہ وسیر آب ہو رہا ہے۔ ان کی تربیت میں اور آگہی میں جناب سی آر اسلم، سید مطلبی فرید آبادی اور ان کے ساتھیوں اور ان کے پرچہ ''**عوامی جمہوریت**'' کے اثرات شامل ہیں، جو انہیں ایک اچھا انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔

فنونِ لطیفہ کے میدان میں لاہور کا ایک اور بڑا تحفہ آرٹسٹوں کی صورت میں کوئٹہ اور بلوچستان کو ملا۔ وہ لاہور کے بین الاقوامی شہرت کے فنون لطیفہ کے مرکز لاہور کے نیشنل آرٹس آف کالج سے تین پاکستان کے مشہور آرٹسٹوں کی صورت میں حاصل ہوئے۔ جناب جمال شاہ، جناب پروفیسر اکرم دوست اور جناب پرفیسر کلیم خان کی صورت میں۔ نیشنل کالج آف آرٹس کے نام ور اساتذہ نے سلیم ہاشمی، سعید اختر صاحب اور کئی اور نے ان نابغہ کی پوری محبت، خلوص اور کوشش سے پرورش کی اور آبیاری کی ہے۔ آج اُن کی شہرت مسلم ہے۔

جناب اکرم دوست نے تو اب بلوچستان یونیورسٹی میں آرٹسٹوں کا ایک خوب صورت گھونسلا بنایا ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ انہی کی کوششوں سے ان کے چھوٹے بھائی جمیل نے بھی بڑا نام پیدا کیا ہے۔

جمیل بلوچ کی بت تراشی تو تھوڑے عرصے میں بہت شہرت حاصل کر چکی ہے۔ دیکھئے آگے کیا آفاقی صورت اختیار کر لے۔

اسی طرح ان کا سب سے چھوٹا بھائی فہیم بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

اکرم دوست کی محنت بہت ہی قابلِ تعریف اور قدر کی نگاہ کے لائق ہے۔ ڈاکٹر شاہ محمد نے جمیل بلوچ کا بروشر دیکھا تو اس کی نگاہِ بینا اور ذہنِ رسا نے اسے پہچان لیا اور اس کے سب سے مشہور چرواہے کی پینٹنگ کو اپنے رسالہ ماہنامہ ''سنگت'' میں ٹائٹل پر شائع کروا کر آرٹ کو فروغ دینے کی ہمت کی ہے۔

8

لاہور سے ہم سب احباب، بلوچستان کے ترقی پسندوں کا وفد، پروفیسر مجتبیٰ حسین کی لاہور میں حادثے سے وفات کے سبب بہت دل گرفتہ ہو کر کوئٹہ لوٹا۔

یہاں نہایت ہی بے مثال انسان سید امیر الدین، پروفیسر برکت علی، شیام کمار اور پروفیسر بہادر خان رودینی سے ملے۔ لاہور کی روداد ہم نے ان سے بیان کی اور ان کی باتیں سنیں جو مجتبیٰ حسین کی ناگہانی موت کی خبر سن کر انہوں نے ان کی تعزیتی تقریب، ان کی اہلیہ اور بچوں کو کراچی بھیجنے کے انتظامات کیے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر حسن صاحب کے ہمدردانہ رویے سے یہ سارے امور سرانجام دے سکنے کا بتایا۔

زندگی کا کارواں کبھی نہیں رکتا۔ ترقی پسند اور انسان دوستانہ کام نہایت ہی تن دہی اور محنت سے شروع ہوا۔ امیرِ کاروان ڈاکٹر سید امیر الدین بنے اور ان کا بے مثال ادارہ ہیلپر ہائی سکول اور کالج جس کے وہ نہایت ہی محبوب استاد اور پرنسپل تھے۔ ان کی دن رات کی

محنتوں اور فکر اور سوچوں سے ہیلپر تعلیمی ادارہ نے بلوچستان بھر میں نام واحترام پیدا کیا۔ لورالائی، چمن، پشین اور مکران کے دور دراز علاقوں سے لوگ اپنے بچوں کو تعلیم کے لیے ان کے حوالے کرتے رہے۔ تاکہ ان کی اور ان کی نیک اور باوقار بیگم ثریا امیر الدین کی سرپرستی میں یہ بچے تربیت اور تعلیم حاصل کر کے معاشرے کے اچھے انسان بنیں۔

انہوں نے ان بچوں کے لیے اپنی نظروں کے سامنے نگہبانی کرنے کی غرض سے رہائش کا بندوبست بھی کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میر غوث بخش بزنجو نے ان کی اس خدمت اور نیک اور انسان دوستانہ کوشش کو سراہا تھا اور جب بھی کوئٹہ آئے، ان کے گھرانے اور ان کی بیگم سے ملنے جاتے۔ اور اپنے پوتے میرین کو ان کے حوالہ کیا تھا۔

ڈاکٹر سید امیر الدین کی علمی اور فکری خدمت کی کیا تعریف کروں۔ وہ اپنے علمی اور تعلیمی فکر وخیال میں ایک نابغہ تھے اور میرے خیال میں بلوچستان کے لیے ایک نعمت کی صورت میں ناگہاں کہیں سے نمودار ہوئے تھے۔

ڈاکٹر سید امیر الدین ایک اعلیٰ ماہر تعلیم تھے۔ انہوں نے امریکہ سے علم نفسیات میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ پاکستان پہنچتے ہی انہوں نے اپنی زندگی اور روزگار کا ذریعہ تعلیم ہی کو منتخب کیا۔ کئی پبلک سکولوں میں پرنسپل رہے۔ اور بچوں کو علم، تربیت اور شعور دیتے رہے۔ وہ صرف تعلیم کے تنظیمی کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، بلکہ خود بھی درس وتدریس میں نہایت دلچسپی لیتے تھے اور خود تعلیمی ادارے میں جس میں پرنسپل ہوا کرتے تھے، کلاسیں لیتے اور پڑھاتے۔ صرف نصابی کتابوں تک اپنی درس کو محدود نہیں رکھتے بلکہ ماورائے نصاب تعلیم دیتے۔ اخلاق، اجتماعی سرگرمیوں، سائنس، کائنات اور انسانی زندگی کے ہر پہلو سے طلبا کو آگاہ کرتے۔ آگاہی اور شعور دینے کی کوشش کرتے۔ وہ نہ صرف خود ایسا کرتے بلکہ اپنے سٹاف یعنی دیگر اساتذہ کو بھی ایسا کرنے کی ہدایت کرتے۔ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں بھی بہت دلچسپی لیتے۔ کھیل، ڈرامے، ڈیبیٹس اور تقریری مقابلوں میں اپنے طلبا کو سرگرم رکھتے۔ اپنے

ادارے میں اچھے اچھے انسانوں کو تقاریر کے لیے بلاتے۔ طلبا کو دیگر درس گاہوں میں لے جاتے اور واقف کراتے۔

وہ ہمیشہ اچھے استادوں اور استانیوں کی تلاش میں رہتے۔ ملک بھر میں ایسے لوگوں کی تلاش میں جاتے اور اچھے استاد ڈھونڈ کر لاتے۔ ایسا لگتا کہ ان کی زندگی کا اولین نصب العین درس وتدریس تھا اور معاشرہ میں آگاہی، روشن خیالی اور خرد افروزی کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ وہ خود بہت ہی باشعور، آگاہ، روشن خیال، کسی بھی قسم کے تعصب سے دور انسان تھے۔ ہر طرح کے شاؤنزم، لسانی، خونی، مذہبی اور گروہی سے پاک اور دور رہتے۔ نہ خود منصب طلبی کا شوق رکھتے تھے، نہ ایسے لوگوں کو جو ذاتی منصب کے لیے دوڑتے پھریں، اچھا سمجھتے۔ وہ انہیں ناپسند کرتے۔ ترقی پسند جمہوریت پسند، حقوق انسانی، سیکولرازم کے قائل انسان تھے۔ اس لیے ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں رہتے اور ان کی قربت حاصل کرتے۔ ان کی اس طرح کی سرگرمیوں نے انہیں پریشانی، مشکلات اور لوگوں سے دشمنی کا سامنا کروایا۔ مگر وہ بے پرواہ تھے۔ اپنے نیک مقاصد کے لیے ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے۔ مظلوموں، غریبوں اور مشکل میں انسانوں کی طرح حمایت کرتے۔ انہی خیالات کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیگم محترمہ ثریا امیر الدین کو بھی علمی سرگرمیوں میں شریک کیا۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کو بچوں کو تعلیم، تربیت اور آگاہی دینے کے لیے علیحدہ سکول کھول کر نہایت انہماک سے اس عمل میں خود کو سرگرم کیا۔ ان کا اکلوتا بیٹا داراشکوہ بھی علم اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مگن ہے۔ امریکہ سے ابو کی وفات کے بعد آکر پڑھنے میں لگ گیا۔ ایم بی اے کر رہا ہے۔ ایم اے تو سائنس میں پہلے ہی بلوچستان یونیورسٹی سے کر لیا تھا۔ اب ایم بی اے میں ایم اے اسی، یونیورسٹی سے کر رہا ہے۔ شاید اس کا بھی ارادہ اسی شعبہ علم میں پی ایچ ڈی کر کے تدریسی وتعلیمی زندگی اختیار کرنے کا ہے۔ خدا اسے اس نیک کام میں کامیاب کرے، اور اپنے باپ کا نعم البدل ثابت کرے۔

ڈاکٹر امیر الدین کا تعلیمی ادارہ ہیلپر ہائی سکول اور کالج بلوچستان میں مثالی درس گاہ تھا۔ اس درس گاہ نے نہایت ہی قابل، اچھے ذہین طالب علم پیدا کیے ہیں۔

ڈاکٹر امیر الدین کی ان خوبیوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ جو ملک بھر میں سے اچھے لوگوں کو قریب لاتی۔ کوئٹہ میں اکثر ادیب، شاعر اور ترقی پسند دانش ور اُن کے دوست تھے۔

انہوں نے صوبہ بھر میں ہیلپر سکول کھولنے کی کوشش کی۔ چمن، نوشکی، اور پھر مکران، ژوب، لورالائی، نصیر آباد میں ایسی ہی درس گاہیں قائم کرنا ان کا پروگرام تھا۔ مگر مجتبیٰ حسین کی طرح ان کی زندگی نے ساتھ نہ دیا۔

امیر الدین کو حقوق انسانی کے لیے جدوجہد کرنے والوں نے انٹریکٹ کیا اور وہ اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ اس کے لیے انہوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ (طاہر محمود خان جیسے) سنگت اختیار کی: حسین نقی، محترمہ عاصمہ جہانگیر، حنا جیلانی، آئی اے رحمٰن، افراسیاب خٹک اس تحریک کے نمایاں نام ہیں۔ جو امیر الدین کے قریبی دوست رہے ہیں۔

سید امیر لدین اور ان کے ہم فکر دوستوں کی کوشش سے فیض احمد فیض کی یاد میں بہت اچھی اور یادگار تقریب یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی تھی۔ سخت سردی کے باوجود روشن خیال، ادب دوست اور ترقی پسند دانش وروں اور طلبا کی مختلف تنظیموں نے اس میں شرکت کی۔ بلوچستان کے مایہ ناز ترقی پسند تحریک کے اہم رکن **لٹ خانہ** کے روح رواں جناب انجم قزلباش بے حد بیماری اور معذوری کی وجہ سے اس یادگار تقریب میں شرکت نہیں کر سکے۔ مگر سید امیر الدین کی کوششوں سے وہ ان سے اس تقریب کے لیے کچھ لکھوا کر خود اُسے پڑھنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

اس تقریب کے وقت محترم پروفیسر استاد مجتبیٰ حسین بقید حیات تھے اور انہوں نے تقریب کی صدارت کی۔ فیض صاحب پر بہت ہی بصیرت افروز دانش افروز مقالہ پڑھا تھا۔

جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ پشتون طلبا نے اس تقریب کے لیے صوبہ سرحد کے بہت ہی مقبول اور مشہور گلوکار اور فن موسیقی کے نام ور اور ماہر موسیقار سردار علی ٹکر کو بلانے کا بندوبست کیا تھا۔ تقریب کا اختتام سردار علی کی وجہ سے بہت ہی دل افروز ہوا۔ اس تقریب کو ویڈیو کر کے ریکارڈ کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر سید امیر الدین ہر وقت اپنے گھر میں یا اپنی مشہور اور قابلِ تعریف درس گاہ میں اس طرح کی تقاریب کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ملک کے نام ور ترقی پسند شاعر احمد فراز کوئٹہ تشریف لائے تھے۔ انہیں گھر بلایا تھا۔ مرحوم مجتبیٰ حسین کی صدارت میں جناب احمد فراز نے کافی دیر تک اپنا کلام سنایا تھا۔ اسی طرح ہیلپر سکول کے ہال میں کئی یادگار تقاریب منعقد کی گئی تھیں۔ مشہور دانش ور اور ملک کے نہایت ہی مقبول مجلّہ **ارتقا** کے ایڈیٹر محترم راحت سعید صاحب سید امیر الدین کے لنگوٹیے یار تھے۔ وہ بھی تشریف لائے تھے۔ ترقی پسند ادب اور تحریک پر کوئٹہ کے دانش وروں نے کثرت سے شرکت کی۔ ان تمام تقاریب میں مرحوم عطا شاد جو سید صاحب اور مجتبیٰ حسین کے چہیتے شاعر اور دانش ور تھے، ضرور شرکت کرتے۔ مجتبیٰ حسین صاحب کی وفات کے بعد ان کی یاد میں اور ان کے یوم وفات کی مناسبت سے ایک بہت ہی یادگار تقریب ہوئی۔ کوئٹہ کے دانش وروں، پروفیسروں اور طالب علموں نے بھرپور شرکت کی۔ اس تقریب کے لیے ڈاکٹر امیر الدین نے مشہور ترقی پسند ادیب، دانش ور اور اردو کے صفِ اول کے نقاد مرحوم و محترم ممتاز حسین (جو کسی وقت کوئٹہ میں بطور استاد رہ چکے تھے، اور انجم قزلباش و عین سلام بخاری کے استاد رہ چکے تھے) کو بلایا تھا۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں اُن کی رہائش کا اہتمام کیا گیا۔ ممتاز صاحب نہایت ہی مہربان اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی تازہ شائع شدہ تصانیف لائے تھے۔ ایک امیر خسرو پر تھی اور دوسری مولانا الطاف حسین حالی پر۔ یہ دونوں کتابیں یونیورسٹی کے اساتذہ اور کوئٹہ کے دانش وروں نے خرید لیں۔ الطاف حسین حالی پہ تنقید کی

کتاب کے شروع میں غالب کا یہ شعر درج تھا، جو فارسی میں تھا:

بامن میاویز لے پدر۔ آئین آذر رانگر
آن کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد

اس شعر نے تو میرا ذہن اور دل جیت لیا۔ نظریہ ارتقا اور ترقی پسندی کی اس سے زیادہ کیا وضاحت ہوسکتی ہے؟!

مجتبیٰ حسین کی اس یادگار تقریب کے لیے سید صاحب نے دعوتی کارڈ بہت خوب صورت چھپوایا تھا۔ اس پر مجتبیٰ حسین کا خوب صورت اور پرکشش پورٹریٹ چھپا تھا، جسے بلوچستان یونیورسٹی کے فائن آرٹ کے مایہ ناز استاد اکرم دوست نے تیار کیا تھا۔ اکرم دوست کی بنائی ہوئی اس تصویر کی سب نے تعریف کی۔

اب قسمت کا کرنا دیکھیے؛ ڈاکٹر امیر الدین کو ایک ایسا ہم خیال ساتھی قدر دان رفیق کار ہاتھ آیا جو ان کی زندگی کے آخر سانس تک اُن کے وفادار اور قدر دان دوست ثابت ہوئے۔ امیر الدین نے زندگی کے آخری دن اور آخری شامیں اور زندگی کی آخری سانسیں اسی یارِ وفادار کی آغوش میں جان دی۔ یہ دوست اور رفیق ان کے نام ور ادیب، دانش ور، پروفیسر، مصنف اور بلوچستان کے قابلِ قدر اور قابلِ احترام ڈاکٹر شاہ محمد مری ہیں۔ انہیں اس لیے میں نے شمعِ فروزاں کا لقب دیا ہے اور اس کے ساتھ اس عنوان کے تحت مولانا جلال الدین رومی کا یہ نہایت بامقصد اور خرد افروز شعر لکھتا رہا ہوں:

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

ڈاکٹر امیر الدین کی فکر و آگہی کو پھیلانے کا عمل صرف کوئٹہ اور بلوچستان تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اُسے ملک بھر میں پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے ترقی

پسند دانش وروں، ادیبوں اور انسان دوستوں کو ایک لڑی میں پروئیں۔ اس کے لیے وہ، ڈاکٹر شاہ محمد مری اور ان کے دیگر رفقا وقتاً فوقتاً کراچی، لاہور اور پشاور جاتے اور ایسے لوگوں سے رابطہ استوار کرنے کی کوشش کرتے۔ کراچی سے چوں کہ اُن کا تعلق تھا اور طالب علمی کے زمانے سے ان کے احباب اور رفقا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ خصوصاً **ارتقا** والوں سے ان کی بہت ہی قریبی دوستی تھی۔ وہ کراچی اور کوئٹہ کے مابین ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے۔

چنانچہ ان کی دعوت پر یہ حضرات کوئٹہ تشریف لاتے، ہم سے ملتے اور باہمی تبادلہ خیال کرتے۔ مسلم شمیم، راحت سعید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محمد بن احمد صاحب کئی مرتبہ کوئٹہ آئے۔ اس کے علاوہ جو بھی کسی تقریب میں شرکت کے لیے آتا، انہیں امیر الدین صاحب اپنے احباب سے ملواتے۔ ایم بی نقوی، پروفیسر شمیم احمد، افراسیاب خٹک، حسین نقی، اور اس طرح کئی اور حضرات۔ ان کا مقصد تھا کہ روشن خیال، ترقی پسند، انسان دوست دانش ور ملک بھر میں ایک ساتھ مل کر لوگوں کو شعور اور آگہی دیں اور عام انسانوں کی ترقی کے لیے متحد ہو کر کام کریں۔

ایک مرتبہ محترمہ فہمیدہ ریاض ملک کی مشہور خاتون دانش ور شاعرہ اور ادیب اپنی بچی کے ساتھ کوئٹہ آئی تھیں اور اپنے ایک قریبی عزیز کے یہاں مہمان ٹھہریں تھیں۔ امیر الدین صاحب اور ان کے ساتھیوں نے عطا شاد آڈیٹوریم، آرٹس کونسل بلوچستان میں ان کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا۔ کوئٹہ کے ادبا۔ شعرا، دانش وروں اور طلبا نے ان کی باتیں سنیں۔ اشعار سنے، ان کی مشہور نظم ''مجسمہ گرا دیا''، یعنی سویت یونین کے انہدام کے بعد لینن کا مجسمہ گرا دیا گیا تھا۔ اُسے سن کر سامعین بہت متاثر ہوئے۔

جب تک فہمیدہ ریاض کوئٹہ میں تھیں، ہر شام کو ہم سب ان سے ملتے رہے۔ اسی طرح حبیب جالب، کشور ناہید جب آتے تو بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

امیرالدین بہت بڑے دانش ور اور ماہر تعلیم تھے۔ خود بھی بہت مطالعہ کرتے اور اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بھی کتابیں پڑھنے کی تجویز اور بندوبست کرتے۔

میں نے ان کی محبت میں ان سے کئی اچھی کتابیں حاصل کیں اور پڑھیں۔ پاولو کوئہلو کی بہت مشہور کتاب **الکیمسٹ**، قرۃ العین حیدر پہ لکھی گئی ایک امریکی مصنف کی مشہور کتاب کا ترجمہ، اور کئی دیگر کتابیں۔ ابنِ رشد پر مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو رایگان کی کتاب اردو میں لا کر دی۔ میری درخواست پر وہ لاہور سے مشہور صوفی اور وسط ایشیا اور افغانستان میں مقبول ترین برصغیر کے فارسی شاعر بیدل کی ایک کتاب لائے۔

میں 1993 میں جب فالج کے ایک شدید حملہ کے سبب بیمار ہوا تو امیرالدین صاحب، شاہ محمد، پروفیسر بہادر خان، پروفیسر برکت علی، محترم شیام کمار، ڈاکٹر سرور صاحب، ڈاکٹر خدائیداد، محترم تمکین احمد، محترم بدرالحسن صاحب (جب کوئٹہ میں ہوتے)، جاوید اختر صاحب، اور کئی احباب اُن کے ہمراہ میرے گھر آتے۔ بیمار پرسی کے علاوہ مجھے حوصلہ دینے کے لیے آتے۔ ان دنوں جمعہ کو چھٹی ہوا کرتی تھی تو امیرالدین صاحب نے اُسے جمعہ پارٹی کا نام دیا تھا۔ بعد میں اتوار کو چھٹی کا اعلان ہوا۔ چنانچہ ہر اتوار کو باقاعدگی سے یہ پارٹی میرے گھر میں جمع ہوتی۔ نہایت خوشی اور دل افروزی سے یہ محفل برقرار رہتی۔ بہت ہی خوشی ہوتی۔

امیرالدین صاحب کو شاعری سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اکثر بہت ہی خوب صورت اشعار، فیض، غالب، میر، اور کئی اور شعرا کے سناتے، بہت ہی خوب صورت اور دل لگا کر خوب صورت انداز سے سناتے۔ ایک شعر جو مجھے یاد ہے، وہ میر تقی میر کا تھا، (شاید)؛

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

فیض صاحب پر تو امیرالدین عاشق تھے۔ اُن کے کئی اشعار انہیں زبانی یاد تھے اور سنایا کرتے۔ ایک مرتبہ ان کی نہایت ہی نیک اور قابل و باشعور شاگرد نوشین قمبرانی، پروفیسر نادر قمبرانی کی قابلِ فخر بیٹی اتوار پارٹی میں شامل تھیں۔ امیرالدین صاحب نے فوراً میری کتابوں میں سے فیض صاحب کی کتاب ڈھونڈ کر نوشین کے حوالے کی اور انہوں نے گا کر فرمائشیں پوری کیں۔ کوئٹہ میں جب بھی یہ احباب کسی تقریب کا اہتمام کرتے تو نوشین اپنی نہایت خوب صورت، مقبول آواز اور انداز سے فیض صاحب کو گا کر سناتی ہیں۔

ڈاکٹر سید امیرالدین کو کس طرح یاد کروں۔ ان کی کن کن باتوں کا ذکر کروں۔ بدقسمت تھے ہم کہ وہ اپنی بیگم کو ائیر پورٹ پہنچا کر بہت ہی عجلت میں تیز گاڑی چلا کر اتوار پارٹی میں شمولیت کے لیے آ رہے تھے کہ ان کی گاڑی کو حادثہ ہوا۔ وہ خود تو پہنچ نہ سکے، مگر ان کی وفات کی خبر اتوار پارٹی جوان کا انتظار کر رہی تھی، نے سنی۔

اُن کا نقصان کوئٹہ اور بلوچستان کے ترقی پسندوں اور دانش وروں کے لیے بہت زیادہ تھا۔ ان کو بلوچستان اور ان کے لوگوں سے بے حد محبت تھی۔ وہ زندگی بھر ان کی خدمت کا ارادہ کیے ہوئے تھے اور وصیت کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو جائے تو انہیں کوئٹہ اور بلوچستان میں دفن کیا جائے۔ مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ ہم ان کی وصیت کو پورا نہ کر سکے۔

9

چھ مئی 1993 کی رات مجھ پر فالج کا حملہ ہوا۔ لیکن ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ شدید نہیں تھا۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سرفراز جمالدینی میرے قریبی عزیز یونیورسٹی کمپس میں اپنے بھائی پروفیسر اکرم دوست کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ فوراً میرا معائنہ کرنے گھر دوڑے آئے۔ انہوں نے دیکھا۔ ایک انجکشن لگایا اور بتایا کہ ایک کلاٹ ذہنی شریان میں آیا تھا اور خوش قسمتی سے خود بخود دور ہوا اور خون ذہن کو جاری ہوا۔ اس لیے کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔

صبح کو ڈاکٹر سرفراز مجھے ہسپتال لے گئے۔ اسپیشل وارڈ میں نمبر چھ کمرہ میں مجھے لٹایا گیا۔ میرے احباب سید امیر الدین اور ڈاکٹر شاہ محمد مری کو اطلاع ہوئی تو کئی دوست ہسپتال پہنچے۔ میرا علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر افتخار کاسی اور ڈاکٹر محبوب علی زہری میرے معالج تھے۔ بہت ہی اچھا علاج کیا۔ آج تک انہی کی بتائی ہوئی دوا لے رہا ہوں۔ ایک ماہ اسی کمرے میں رہا۔ پھر مجھے گھر منتقل کیا گیا۔ ایک دو ماہ بعد مجھے کراچی لے جایا گیا۔ ضیا الدین ہسپتال کے

نیوروسرجن کو دکھایا گیا۔ وہاں میرے بھائی اور دوست غلام محمد شاہوانی کے چھوٹے بھائی عزیز احمد شاہوانی نے خبر پاتے ہی کراچی جا کر اس ہسپتال میں میرے علاج کا انتظام کیا تھا۔ نیوروسرجن ان کے دوست اور بیگم کی طرف سے رشتہ دار تھے۔ عزیز احمد نے تمام علاج کا ذمہ لیا اور بہت محبت سے میرا علاج کروایا۔ پھر مجھے میڈ ایسٹ ہسپتال میں ڈاکٹر جہاں زیب میرے بھتیجے کے گھر کے قریب منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹر جہاں زیب کی کوششوں سے ڈاکٹر ذوالفقار بھٹی کے پاس معائنہ کے لیے لے گئے جناح ہسپتال۔ انہوں نے بھی دیکھا۔ ان تینوں ہسپتال کے ماہرین نے ڈاکٹر بھٹی جو عالمی شہرت یافتہ نیوروسرجن ہیں، کسی نے بھی کوئٹہ کے ڈاکٹروں کے علاج اور دوا میں تبدیلی نہیں کی۔ بھٹی نے بتایا کہ بس بلڈ پریشر کو ان دواؤں کے ذریعے کنٹرول میں رکھا جائے اور فزیوتھراپی کرواتے رہیں۔ اس سے زیادہ علاج ممکن نہیں۔

چنانچہ آج تک گیارہ سال گزرے، انہی ڈاکٹروں کی ہدایت پر کاربند ہوں۔ اور الحمدللہ ابھی تک جی رہا ہوں۔ دیکھو اور کب تک جیوں گا۔

آٹھ مئی 1922ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے دوسرے روز میرے ساتھیوں نے میرا یومِ پیدائش منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ میرے ہسپتال کے کمرے میں وہ صبح ہی ایک کیک لائے تھے اور مجھے اسے کاٹنے کے لیے کہا۔ سید امیر الدین، شاہ محمد مری، ڈاکٹر خدائیداد، بہادر خان رودینی، شیام کمار، سرور، پروفیسر برکت علی، تمکین صاحب شاید میرے بیٹے اور یاد نہیں کون کون موجود تھا۔ انہوں نے تالیاں بجا کر نہایت خوش ہو کر میرا یوم پیدائش منایا اور مجھے توانائی بخشی۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔

اسی روز شاید مجھے کہا گیا کہ ڈاکٹر شاہ محمد مری کے لیے ان کے ماہنامہ **نوکیں دور** کے لیے اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کردوں۔

دوستوں کی اس بے مثال پذیرائی اور محبت نے مجھے ہمت دی کہ میں نے نوکیں دور کے لیے لکھنا شروع کیا اور لٹ خانہ سے متعلق اپنی یادداشتوں کو تحریر کرنے کا آغاز کیا۔

اس روز سے مجھے شاہ محمد کی قربت اور محبت کا اندازہ ہوا جو تادمِ تحریر برقرار ہے اور انشااللہ زندگی بھر برقرار رہے گی۔

نوکیں دور جو کامریڈ عبدالکریم شورش کی یادگار ہے، اُسے اُن کے بڑے بیٹے کریم شیہک نے شاہ محمد کے حوالے کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ شاہ محمد اسے کب سے شائع کر رہے تھے۔ **سنگت** کی جب ابتدا ہوئی تو مجھے شاہ محمد نے بتایا کہ دو تین سال سے **نوکیں دور** شائع کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میری یادداشت بیماری اور فالج سے زیادہ ابتر ہوگئی تھی۔ اس لیے مجھے اس سے پہلے کے ایسے واقعات کم یاد آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ **نوکیں دور** جو ترقی پسندی، کمیونسٹ پبلی کیشن کا سلسلہ تھا۔ یعنی نیا زمانہ، نیوا ایج، نیا دور، نیا سویرا۔ جب شورش بابو نے بلوچی میں **نوکیں دور** نکالنا شروع کیا تھا تو ان کے ذہن میں ایسا ہی کچھ تھا۔ اُن کی وفات کے بعد شاہ محمد نے اُن کی یاد کو تازہ کیا اور اُن کے نظریات اور کمٹمنٹ کو برقرار رکھا۔ بلکہ اسے مزید ترقی دی اور **نوکیں دور** کے بعد ماہنامہ **سنگت** کے نام سے موجودہ ماہنامہ کو شائع کرنا شروع کیا۔

''**سنگت**'' آج پاکستان کیا، ہندوستان بھی جاتا ہے اور وہاں کے ترقی پسند اسے پڑھتے اور پسند کرتے ہیں۔ جیسے یہاں کے ترقی پسند ماہنامہ ''**حیات**'' دہلی کو پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ ''**حیات**'' کا مریڈ سید سجاد ظہیر کا یادگار پرچہ ہے۔ کوئٹہ سے دہلی جا کر انہوں نے ''**حیات**'' شائع کرنا شروع کیا تھا۔ دیگر بڑے کاموں کے علاوہ ''**سنگت**'' میرے خیال میں بلوچستان کی ترقی پسند صحافت میں بے مثال اضافہ ہے۔ یقیناً غلام محمد شاہوانی کا ''**نوائے وطن**'' بہت مقبول ہوا تھا۔ اُس وقت کے حالات اور سختیوں میں غلام محمد بے مثال صحافی تھے اور اب **سنگت** نے بلوچستان کی ترقی پسند صحافتی روایات میں نہایت قابلِ تعریف اور بے حد اضافہ کیا ہے۔

سنگت اور شاہ محمد کوئٹہ اور بلوچستان کی ترقی پسندی کے نشان بن گئے ہیں۔

سنگت میں سماجی، سیاسی، نظریاتی، سائنسی اور انسان دوستی کی بہت دل پذیر تحریریں

اور باتیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر شاہ محمد جیسے ذہین اور کمیٹڈ نوجوان ہی ایسے کام کر سکتے ہیں۔

سنگت نے ترقی پسند روایات میں بہت ہی نئے تجربوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس میں تمام زبانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ لسانی شاؤنزم کو بالکل نابود کر دیا گیا ہے۔ کسی بھی زبان میں لکھاری اپنے خیالات تحریر کر کے **سنگت** میں چھپوا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر شاہ محمد مری اور **سنگت** کے انسان دوستانہ اور ترقی پسندانہ خیالات کے خلاف نہ ہوں۔

جب سے ڈاکٹر شاہ محمد سے قربت نصیب ہوئی ہے اور خصوصاً ان کی تالیفات اور تصانیف نظر سے گزریں ہیں، میں انہیں بہ غور پڑھتا رہا ہوں۔ خصوصاً ان کی صحافت اور **نوکیں دور** اور خاص کر ماہنامہ **سنگت** جس کو میں ہر ماہ نہایت غور اور دلچسپی سے شمارے کے ایک ایک چھپے ہوئے لفظ کو پڑھتا ہوں۔ مجبور ہوں کہ اس کے بارے میں میں اپنی رائے تحریر کروں۔

ڈاکٹر شاہ محمد میرے لیے اور میرے خیال میں کوئٹہ اور بلوچستان میں ایک ابھرتا ہوا جینئیس ہے۔ یقیناً ان سے اختلاف کرنے والے میری اس رائے سے متفق نہیں ہوں گے اور مجھ سے اختلاف رکھتے ہوں گے۔ مگر میں اپنے ضمیر اور اپنے شعور کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ ایک جینئیس ہیں؛ نابغہء روزگار۔

سنگت کی پالیسی مجھے بے حد پسند ہے۔ ملک میں یقیناً **سنگت** سے زیادہ اچھے کام کرنے والے مجلّے اور ماہنامے ہیں، جو مجھے اسی طرح پسند ہیں۔ ان کے بارے میں بھی اسی قسم کی رائے رکھتا ہوں۔ مثلاً مجلّہ **ارتقا** محترم راحت سعید اور ان کے ہمراہیوں کے بارے میں بھی یہی رائے ہے کہ وہ انسانی شعور کو آگاہی بخش رہے ہیں۔ اسی طرح **نوائے انسان** اور ان کے مدیر وجاہت مسعود اور کراچی سے چھپنے والا ماہنامہ **بدلتی دنیا** کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔ جس قدر پڑھا ہے، ان سے یہی توقعات وابستہ ہیں۔ **ارتقا** کی سماجی کوششیں اور وہ ادارہ جو سماجی اور سائنسی فکر کو آگے بڑھاتا رہا ہے، شعور کی ترقی اور امن پسندی کو پروان چڑھاتا رہا ہے، قابلِ تعریف ہیں۔ اس ادارے سے ملک کے بہت ہی نام ور اور بلند پایہ

مفکر اور دانش ور وابستہ رہے ہیں اور تقریریں کی ہیں ۔ مرحوم ومحترم کرار حسین صاحب ، جسٹس دراب پٹیل ، مرحوم حمزہ علوی صاحب ، ایم بی نقوی صاحب اور کئی گرامی قدر دانش مند جن کا نام یاد نہیں اور ذہن ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

ارتقا نے برصغیر کے نہایت ہی نام آور مقبول اور قابلِ قدر ادیبوں ، شاعروں ، کمیونسٹوں کی بھی **ارتقا** کے توسط سے زندگی کے بارے میں اور ان کی خدمات کو قارئین کے لیے پیش کیا ہے ۔ ان سے ہمیں آگاہی ہوئی ہے ۔ مثلاً فیض صاحب ، جوش ملیح آبادی ، کیفی اعظمی ، مشہور کمیونسٹ لیڈر دادا امیر حیدر ۔ مگر افسوس کہ **ارتقا** میں سید سجاد ظہیر ، سید حسن ناصر ، سید امام علی نازش ، سائیں عزیز اللہ کے بارے میں نہیں پڑھا ، اس نامور مجلّہ میں ۔

ایک اور مجلّہ بلکہ ماہنامہ کی خدمات کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی (ابھی یاد آیا) ماہنامہ **طلوعِ افکار** محترم انجم صاحب کا خرد افروز اور ادب ودانش پرور ۔

صہبا لکھنوی اور ماہنامہ **افکار** کی ادبی اور سماجی اور دانش ورانہ خدمات برصغیر میں تو 'ایک شمع فروزاں' کی ایک قسط میں تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں ۔

ماہنامہ **سنگت** اور اس سے پہلے **نوکیں دور** کی پالیسی نہایت واضح اور ہر دل عزیز رہی ہے ۔ سب سے پہلے انسان دوستی ، رواداری ، علم وآگہی کی تشہیر ، سائنسی سماجی علم اور ترقی پسندی کو سماج میں پھیلانا ، مردم آزاری سے گریز ، تنگ نظری ، ہر قسم کے شاؤنزم (مذہبی ، نسلی ، لسانی) کے خلاف غرض انسانی اقدار جو انسانی جدوجہد ، تجربہ اور سائنسی دریافتوں کے نتیجہ میں آج کل سوشلسٹ ، ترقی یافتہ سیکولر ، جمہوریت پسند عوام اور مخلوق میں مہذب انداز میں مروج اور انسانی شعور اور سائنسی تحقیقات کے نتیجہ میں مقبول ہو رہے ہیں..... یہ سب سنگت کی پالیسی کا حصہ اور مطمع نظر ہیں ۔

شاہ محمد مری ان پرچوں میں اپنی ان تمام کوششوں کو پیش کرتے آئے ہیں جو اس واضح پالیسی میں مضمر ہیں ۔

سب سے پہلا عمل شاہ محمد نے ہمارے طبقاتی اور استحصالی نظام میں ان مجبور اور ظلم کی چکی میں پسے ہوئے محنت کشوں کی زندگی کے بارے میں تحقیقات کر کے ان پرچوں میں پیش کیا تھا ۔ یہ تحقیق بلوچستان کے کوئلہ کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کے بارے میں تھی ۔ سوات ، بنیر ، باجوڑ اور کوہستان کے انتہائی پسماندگی ، غربت اور زندگی کے دیگر مسائل میں مبتلا انسان تھے ۔ وہ مجبور ہوتے کہ اپنی زندگی ، اپنے بچوں اور خاندان کے ہاتھوں کسی کوئلہ کے جوڑی دار یا جمعدار کے ہاتھوں خود کو بیچتے ۔ اکثر مردہ ان کی لاشیں ان کے گھر اور آبائی قبرستان پہنچتیں ۔

شاہ محمد کی انسان دوستانہ فکر اور روشن شعور ایسے ہی لوگوں کے لیے وقف ہیں ۔ شاہ محمد نے اپنے شعبہ تحقیق (صحت) کے میدان میں بھی بہت اچھے کام کرنے کی جہد کی ۔ لیکن ایسے ہم فکروں کی کمی کے سبب بہت کامیاب نہیں ہوئے ۔ شاہ محمد نے پروگریسو ڈاکٹروں کا گروہ منظّم کرنے کی کوشش کی ۔ مگر بلوچستان میں قوم پرست سیاست دانوں کی غلط روش کے سبب طلبا کی طرح ڈاکٹروں میں بھی غیر انسانی فکر پشتون ، بلوچ کے امتیاز نے تباہی مچا رکھی ہے ۔ غریب مریضوں میں بھی یہ فرق کیا جاتا کہ پشتون ہے یا بلوچ ، تب ڈاکٹر اس طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ سب ڈاکٹر ایسے نہ تھے ۔ ان میں کئی محترم اور انسان دوست اور اپنے زندگی کے بہترین پیشہ سے فکری اور عملی طور پر وابستہ ڈاکٹر ہیں ۔ مگر قوم پرستی کے اس غلط رویہ نے نوجوانوں کو بہت متاثر کیا تھا ۔ بہر کیف شاہ محمد مری ان چیزوں سے پست ہونے والے انسان نہیں ۔ وہ بدستور اپنی کوشش میں سرگرم رہے ۔ جگہ جگہ میڈیل کیمپوں کا اہتمام کیا اور لوگوں کے علاج کا بندوبست کرتے رہے ۔

اسی طرح شاہ محمد نے ماہی گیر ، محنت کشوں کے بارے میں تحقیق کی ۔ اس کی مشہور کتاب **''سورج کا شہر''** گوادر بندرگاہ میں جا کر ان بد بخت اور غریب ونادار محنت کشوں کے بارے میں تحقیق کی ، ان کے حالات معلوم کیے ۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر سید امیر الدین بھی تھے ، جو حقوقِ انسانی کی تحریک سے منسلک تھے ۔

''**سنگت**'' اور شاہ محمد نے بلوچستان میں شعور و آگاہی پھیلانے میں بڑی محنت کی ہے اور اس سماجی جدوجہد میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے نوجوانوں میں علم و آگاہی کے لیے تحریر اور تعلیم کا رواج دیا۔ غلط اور شدت پسندانہ رویہ کو بڑی حد تک کم کروایا۔ اور نوجوانوں نے **سنگت** میں نہایت ہی خوب صورت تحریریں پیش کی ہیں۔

بلوچستان کے انتہائی پسماندہ علاقوں سے نئی فکر نے جنم لینا شروع کیا۔ نہایت ہی خوب صورت، ترقی پسندانہ اور انسان دوستانہ تحریریں **سنگت** میں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔

سنگت نے نہایت ہی باکمال، ہنرمند لکھاریوں اور شاعروں کو جنم دیا ہے۔ ملکی سطح پر ان کی پذیرائی ہوئی ہے۔ **سنگت** اور شاہ محمد کی کوششوں کے نتائج ہیں جوان گیارہ سالوں میں برآمد ہوئے ہیں۔ اب کس کس کا نام لوں۔ آغا گل کے افسانے اور شبینہ رفعت کی شاعری چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح ملکی سطح کے ادیبوں نے **سنگت** کے لیے لکھنے کی ہمت کی۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، مسلم شمیم، نور محمد شیخ، انیس باقر اور حسن ناصر کے رفیق خاص جناب سمیع داد خان چند مثالیں ہیں۔

شاہ محمد خود انتہائی سیماب صفت اور بے قرار انسان ہیں۔ انہیں قرار نہیں۔ دن رات کام میں مگن رہتے ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کو ایک کامیاب ڈاکٹر، استاد، تنظیم کار کے علاوہ **سنگت** کے لیے ہر قسم کے تراجم، مضامین اور نہ جانے کیا کچھ۔ یہ تک کہ فوک اور بچوں کے ادب کے لیے بھی مختلف زبانوں سے تراجم پیش کرتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق کے لیے ''**بلوچ سماج میں عورت کا مقام**'' پر ان کی زیر طبع کتاب آرہی ہے۔ یہ ان کی دوسری کیا بلکہ تیسری چوتھی تحقیق ہے۔ وہ نہایت معروضی انداز سے سوچتے ہیں۔ قلم اور علم کے ساتھ حتیٰ الوسع انصاف کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اس غلط فکر کی تردید ہو جاتی ہے کہ بلوچ معاشرہ میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ ایک قبائلی اور تنگ نظر فکر ہے جو بلوچ نوجوانوں اور طالب علموں میں پھیلائی گئی ہے۔ یا یہ فکر کہ سرداری نظام اور قبائلی نظام میں فیصلے اور جرگے نہایت انصاف سے کیے جاتے ہیں۔ یہ فکر

نہایت ہی مذموم ہیں۔ اس فکر کو وہ لوگ قبول کرتے ہیں جو سماجی ترقی اور علم ارتقا سے نابلد ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ بلوچ سماج ترقی کرے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں صرف بلوچ ہی ایسے حالات میں ہیں۔ دنیا کی کئی اقوام صدیوں پہلے ایسے دور سے گزری ہیں۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری بڑے کھوجی ہیں۔ وہ ہمیشہ نوادرات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بلوچستان کی شخصیات کے بارے میں ان کی کھوج قابل تعریف ہے۔ انہوں نے بلوچستان کے محنت کشوں کے ایک گم نام راہنما کو ڈھونڈ نکال کر اپنے قارئین کو پیش کیا۔ وہ شخصیت قاضی داد محمد کی ہے۔ ان کے بارے میں ان کے پرچوں میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ وہ کون تھے، کہاں کے تھے اور انہوں نے کس طرح محنت کشوں کی راہنمائی کی تھی۔

انہوں نے بلوچستان کے مشہور اور معروف و مقبول سیاسی راہنما نواب یوسف علی خان مگسی کے بارے میں بہت کاوش کی ہے۔ ان کی زندگی کے مشن، عوام دوستی اور ترقی پسند فکر اور روشن خیالی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ باقاعدہ اسناد اور حوالے سے۔

مرحوم اسکالر اور صحافی **ملک محمد پناہ** کے دور کے ہفت روزہ ''**نوائے وطن**'' کی فائل سے نہایت ہی کمیٹڈ مگر گم نام (اپنے دور میں نہیں، لیکن بعد میں بلوچستان کے سیاسی منظر نامے میں کبھی ان کا ذکر نہیں ہوا) نکال کر ماہنامہ **سنگت** کے پڑھنے والوں کو پیش کیا۔ پھر اُسے کتابی صورت دی۔ وہ شخصیت کامریڈ محمد اسلم اچکزئی کی تھی۔ **ملک محمد پناہ** ان کے ہمراہ بہ حیثیت معاون ایڈیٹر کے کئی پرچوں میں کام کرتے رہے۔ **ملک** صاحب نے نہایت خوبصورت اور حقائق پر مبنی انداز میں اسلم خان اچکزئی کو گم نامی سے نکال باہر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک بڑی خدمت ہے جسے ماہنامہ **سنگت** اور ڈاکٹر شاہ محمد نے انجام دیا ہے۔

اسی طرح بلوچستان کے اپنے عہد کے نامور نابغہ علامہ اخوندزادہ عبدالعلی کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ خدا کرے اسلم خان کی طرح کی ان کی سوانح حیات چھاپ سکیں۔ ویسے ہر شمارے میں ''باتیں علامہ عبدالعلی کی'' کے عنوان سے کچھ نہ کچھ شائع ہوتا ہے۔ راقم کو سکول

کے ایام میں اپنے والد کے ہمراہ اس نام ور ہستی کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میرے تمام بزرگ ان کے مداح تھے۔ اور جہاں اور جس طرح میں نے انہیں دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دانش اور روشن خیال علم کا سمندر تھے۔

''سنگت'' میں بلوچستان کی ایک نہایت اہم شخصیت اور سیاسی راہنما یوسف علی خان کے ہم عصر اور رفیق کار خان عبدالصمد شہید کی زندگی کے کئی اہم پہلو ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کی حیثیت کے مطابق احترام اور سپاس گزاری کی گئی ہے۔

بلوچستان کے چند ایک اور نام ور راہنماؤں خصوصاً بابو عبدالرحمٰن کرد، جو سیاسی رہنما بھی تھے اور براہوئی کے مشہور شاعر، تاریخ نویس اور دانش ور تھے، ان کے بارے میں بھی تفصیل سے مضامین چھپتے رہے ہیں۔

ادیبوں کی بھی بہت ہی اور حتیٰ الامکان پذیرائی ہوئی ہے۔ عبدالرحمٰن غور، کامریڈ انجم قزلباش، کامریڈ کامل القادری، گل خان نصیر، آزاد جمالدینی، عطا شاد، کامریڈ خدائیداد، کے بارے میں خاصے شمارے چھپے ہیں۔ اور ان شخصیات کی یاد میں کئی تقریبات بھی منعقد کی جاتی رہی ہیں۔

آخر میں بس اتنا کہوں گا، ڈاکٹر شاہ محمد سچے انسان ہیں۔ سچ اور سچائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ سچ پسند کرتے ہیں۔ سچائی کی تلاش میں ہیں۔ سچوں کو پسند کرتے ہیں، سچ سنتے ہیں، سچ بولتے ہیں اور سچ لکھتے ہیں۔

یہ ہے قارئین ماہنامہ ''سنگت'' (کوئیں دور) اور ڈاکٹر شاہ محمد کے دانش ورانہ، خرد افروزانہ اور کمیٹڈ خدمات بہت ہی مختصراً بیان کی ہیں۔ اگر انہیں 'ایک شمع فروزاں' نہ کہوں تو میرے نزدیک زیادتی ہوگی۔

سنگت اکیڈمی کی کتابیں

www.sangatacademy.net

جلد نمبر	کتاب کا نام	صفحات	قیمت
1	بلوچ۔ مہرگڑھ سے ریاست کی تشکیل تک	240	400
2	بلوچ۔ جاگیرداری عہد	248	450
3	بلوچ۔ نوآبادیاتی عہد	322	495
4	بلوچ۔ سرمایہ داری عہد	زیرطبع	زیرطبع
5	بلوچ۔ ساحل وسمندر	220	300
6	بلوچ۔ عورتوں کی تحریک	112	150

دیگر کتب

1	پتیں شہید	عبدالرحمٰن پہوال	45	20
2	وفا کا تذکرہ	شاہ محمد مری	184	250
3	شمع فروزاں	عبداللہ جان جمالدینی	80	50
4	اسلم اچکزئی	ملک محمد پناہ	37	20
5	فہمیدہ ریاض	شاہ محمد مری	120	200
6	لٹ خانہ	عبداللہ جان جمالدینی	248	250
7	کارواں کے ساتھ	گل خان نصیر اردو شاعری	264	200

8	علم المعیشت	سی آر اسلم	126	150
9	چین آشنائی	شاہ محمد مری	336	280
10	بلوچستان کی ادبی تحریک	شاہ محمد مری	200	300
11	بلوچی زبان وادب	شاہ محمد مری	504	790
12	بروقت	وحید زہیر	140	200
13	تلخیاں	ساحر لدھیانوی	250	250

تراجم اردو

1	اباسین پرسحر ہوتی ہے	سلیمان لائق ر شاہ محمد مری	165	150
2	یادداشتیں	صدر الدین عینی ر شاہ محمد	168	250
3	افلاس کا کارواں	نور محمد ترہ کی ر شاہ محمد	86	120
4	سپارٹیکس	ہاورڈ فاسٹ / شاہ محمد	320	495
5	منتخب سوویت افسانے	شاہ محمد	335	250
6	سٹیزن ٹام پین	ہاروڈ فاسٹ ر شاہ محمد	375	495
7	گندم کی روٹی	عبدالستار پردلی ر شاہ محمد	96	150
8	بلوچ نے مجھے دھکا دیا	گوہر ملک / شاہ محمد	130	100
9	مری بلوچوں کی جدوجہد آزادی	لیمبرک / شاہ محمد	103	100
10	جینی کے خطوط	جینی ویسٹ فالن ر شاہ محمد	168	300

11	کارل مارکس کی داستانِ حیات	فرانز مہرنگ ر شاہ محمد	630	750
12	مستیں توار	آزاد جمالدینی ر انجم قزلباش	40	20
13	کارل مارکس اور زندگی افکار	والکوف ر شاہ محمد مری	254	130
14	لوہسون کے منتخب افسانے	شاہ محمد مری	190	300

تراجم بلوچی

1	کمیونسٹ مینی فیسٹو (بلوچی)	مارکس، اینگلز / شاہ محمد	128	200
2	جہاں جسکیں دہ روش	جان ریڈ ر شاہ محمد	270	400
3	آزادی	کرسٹوفر کاڈویل ر شاہ محمد	60	100
4	کرنلاکس کاغذ نوشتہ نہ کنت	مارکوئیز ر فدا بلوچ	80	150
5	تاریخہ تہا نفرہ کرد	پلیخانوف ر شاہ محمد	55	20
6	دزو لچک	نجیب محفوظ ر شرف شاد	132	200
7	بزغرنا مسٹر	نور محمد ترہ کی ر حمید عزیز آبادی	80	150
8	ایوان ایچیئے مرگ	ٹالسٹائی ر بیزن صبا	66	
9	اینمل فارم	جارج آرویل ر علی دوست	104	150
10	وارڈ نمبر شش	انتون چیخوف ر شرف شاد	88	100

عشاق کے قافلے			
جلد نمبر		صفحات	قیمت
1	مزدک (سپارٹیکس،تھامس مور، توماسوکمپنیلا، جیرالڈونسٹلے،، جین ملیر، ،سینٹ سائمن،اوون،چارلس فیوریئر، پائرے پرودھون ، میخائل باکونن، نکولائی چرنی شیوسکی،ایڈوارڈ ویلنٹ، پیاتر لاورف، نکولائی میخائیلو فسکی،، جین جاریز، فرڈیناںڈ لاسال،آگسٹ بیبل، ویلہلم لب نخت، وولف۔والٹیر،قراۃالعین طاہرہ)۔	152	300
2	شاہ عنایت شہید	80	150
3	ٹام پین	135	200
4	شاہ لطیف	112	200
5	مست	380	500
6	جینی ویسٹ فالین		
7	کارل لب نخت (روزالگزمبرگ،کلارازیٹکن، فرانز مہرنگ ،ٹرگنیف، ٹالسٹائی، جارجی پلیخانوف)۔	زیرطبع	
8	کروپسکایا	زیرطبع	
9	میکسم گورکی (لونا چرسکی، ٹراٹسکی، جان ریڈ، انتون گرامچی، جارجی دیمتروف)۔		

10	یوسف عزیز مگسی	200	395
11	عبدالعزیز کرد (نسیم تلوی،محمد امین کھوسہ، ،عبدالرحمان بگٹی،محمد حسین عنقا،قادر بخش نظامانڑیں، خان عبدالصمد اچکزئی، ملک فیض محمد یوسف زئی)۔	152	250
12	ماؤزے تنگ کم ال سنگ۔	112	200
13	ہوچی منہ (جنرل گیاپ، لی دوان)	120	200
14	فیڈل کاسٹرو (جوزی مارٹی)		
15	چے گویرا (آلندے،شاویز،پبلو نرودا،وکٹر ہارا)۔	زیرطبع	
16	بابو	160	200
17	ملک عبدالرحیم خواجہ خیل (قاضی داد محمد،،ملک محمد پناہ)	زیرطبع	
18	گل خان نصیر	248	200
19	گل خان کے ساتھی	زیرطبع	
20	سی آر اسلم (فیروزالدین منصور، سید مطلبی فریدآبادی)	سٹاک میں نہیں	

21	کرشن چندر (سبطِ حسن،ساحرلدھیانوی ،حبیب جالب،علی عباس جلالپوری، کا کا جی صنوبر حسین،لال خان،نورمحمد چوہان ، خواجہ رفیق ، ملک اسلم، محمد علی بھارا ، اسلم ریڈیو ، فیض احمدفیض،چودھری حفیظ، چودھری فتح محمد، عابدحسن منٹو ، ہرکشن سنگھ سرجیت)	زیرطبع	
22	بابابزنجو	150	300
23	خیربخش مری	زیرطبع	
24	قسورگردیزی (عبدالرحمان کرد، محمد اسلم اچکزئی،ملک محمد پناہ،کرار حسین، لال بخش رند، عبدالرحمٰن غور،زمرد حسین،خلیل صدیقی،،پروفیسر نادر قمبرانی،انور احسن صدیقی،مراد ساحر)	زیرطبع	
25	ماماعبداللہ جان جمالدینی	200	300
26	ڈاکٹرخدائیداد (مراد ساحر ، آزات جمالدینی، نادر قمبرانی،خلیل صدیقی،لال بخش رند،انوراحسن صدیقی)	زیرطبع	
27	سائیں کمال خان شیرانی (صوفی نورمحمد، صاحبزادہ ادریس، ایتھل اور جولیس روزنبرگ)	160	300

28	سوبھوگیان چندانڑیں (حیدربخش جتوئی، شاہ لطیف، امام علی نازش، نذیرعباسی، ابراہیم جویو،شیخ ایاز)	200	200
29	پیٹرس لومبا (گرامچی، بھگت سنگھ، نیلسن منڈیلا،نور محمد ترہ کی،عبدالرحمان پہوال،انجیلا ڈیوس،کرسٹوفر کاڈویل ،وپٹسا روف،محمود درویش۔ہاورڈ فاسٹ)۔		
30	ڈاکٹرامیرالدین (ڈاکٹرفہمیدہ حسین،محمدسرور،اکبر بارکزی ،سائمن غلام قادر،عزیز مینگل، اکرام احمد، محمد علی صدیقی،عبدالستار پردلی،گل بنگلزئی ، دربدرخاک بسر،جاوید اختر،کیسنڈرہ بالچن،سعیدمستوئی،عیسیٰ بلوچ،انوراحمد)	132	250